Regd. L. No.7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

فروری 1974

اس پرچہ میں

"حدود اللہ سے کیا مراد ہے"

پرویز صاحب کا کنونشن کا خطاب

آئندہ پرچہ میں

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء

قائداعظم محمد علی جناح ـــــ اور ـــــ راشٹرپتی ابوالکلام آزاد

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ ۔ پچاس پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون	بدل اشتراک
(۱/۵۰) ڈیڑھ روپیہ	۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوع اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ ۲ لاہور	پاکستان سالانہ ــــ پندرہ روپے غیر ممالک سالانہ ــــ ڈیڑھ پونڈ
نمبر (۲)	فروری - ۱۹۷۴ء	جلد (۲۷)

فہرست

(۱) لمعات ــــــــــــــــــــــــــــــــ ۲

(۲) بچھڑنے والوں کی یاد ــــــــــــــــــــــ ۷

(۳) جبر ہے دل پہ اختیار کیسا تھا۔ ــــــــــ (محترم پرویز صاحب) ــــــ ۱۰

(۴) اسلامی نظریاتی مملکت میں ترقی اور تعلیم کا مفہوم ــــ (پروفیسر علاؤ الدین اختر صاحب) ــــ ۴۱

(۵) برخورداران قوم ــــــــــــــــــــــــ ۴۸

(۶) مرض لاعلاج نہیں ــــــــــ (ڈاکٹر صلاح الدین اکبر صاحب) ــــ ۴۹

(۷) نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے ــــ (چوہدری عطاء اللہ صاحب) ــــ ۵۹

ایڈیٹر: محمد خلیل۔ ناشر: سراج الحق۔ مقامِ اشاعت - ۲۵/بی گلبرگ - لاہور۔ پرنٹر: شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ - اشرف پریس ایبک روڈ - لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

لمعات

گزشتہ اشاعت میں ہم نے مسلم ممالک کے سربراہوں کی مجوزہ کانفرنس کے سلسلہ میں لکھا تھا کہ اگر یہ کانفرنس وحدتِ امت کیطرف پہلا قدم بن جائے تو اس سے بڑھ کر کوئی اقدام خوش کن نہیں ہو سکتا۔ (اس کانفرنس کا انعقاد فروری پر ملتوی ہو گیا ہے)، اس ضمن میں ہمیں قارئین کی طرف سے بہت سے خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں انہوں نے پوچھا ہے کہ ہمارے نزدیک اس وحدت کی عملی شکل کیا ہو سکتی ہے جبکہ یہ ممالک مستقل آزاد مملکتوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان سطور کے محرک یہی استفسارات ہیں۔

اسلام کا منتہائے مقصود اور نصب العین یہ ہے کہ تمام نوعِ انسان کو آئیڈیالوجی (ایمان) کے اشتراک کی بنیاد پر ایک عالمگیر برادری میں متشکل کر دیا جائے۔ اس منتہا تک پہنچنے کے لئے وہ تدریجی طریق عمل اختیار کرتا ہے۔ اس کی تفصیل ہمیں حضور نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ اور صدرِ اول کی تاریخ میں ملتی ہے۔ حضورؐ نے تشکیلِ امت کا آغاز نہایت مختصر پیمانے پر ایک محدود سے خطۂ زمین میں کیا۔ اگرچہ اس امت میں مختلف نسلوں اور ملکوں کے افراد شامل تھے لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی۔ اس جماعت کا بیشتر حصہ مکہ اور اس کے ارد گرد کے علاقوں کے عربوں پر مشتمل تھا۔ مدینہ جا کر اس جماعت کی وسعت میں اضافہ ہوا لیکن پھر بھی یہ من حیث الکل جزیرۃ العرب تک ہی محدود تھی۔ خلافتِ راشدہ (بالخصوص عہدِ فاروقی) میں اس کی وسعت بہت بڑھ گئی۔ اور ایران، شام، فلسطین، عراق، مصر تک کے علاقے اس کی حدود میں شامل ہو گئے اور اس کے ساتھ مختلف نسلوں، وطنوں، اور مذہبوں کے باشندے اسلام لا کر اس امت کا جزو بن گئے۔ لیکن اس وسعت، کثرت اور تنوع کے باوجود یہ اُمت، امتِ واحدہ رہی۔ اس کا مرکز مدینہ تھا اور مختلف علاقوں کی ولایات، اس مملکت کے صوبے تھے۔ چونکہ ابھی تک نظامِ مملکت سیکولر نہیں ہوا تھا ۔ وہ دینی مملکت تھی ۔ اس لئے اس میں کوئی فرقہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی اس میں مختلف پولیٹیکل پارٹیوں کا وجود تھا ۔ پولیٹیکل پارٹیوں کا تصور غیر قرآنی اور خلافِ اسلام ہے۔ بالفاظِ دگر، اُس وقت تک یہ اُمت، امتِ واحدہ تھی۔

بعد میں خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہو گئی، تو امت میں فرقے پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ یاد رکھئے، فرقے پیدا ہی اس وقت ہوتے ہیں جب مملکت سیکولر ہو جائے۔ سیکولر نظام میں، اہمیت سیاسی استحکام کو حاصل ہوتی ہے۔ مذہب سے اُسے چنداں واسطہ نہیں رہتا۔ مذہب میں دو چار چھوڑ، بہتّر فرقے بھی کیوں نہ پیدا ہو جائیں سیکولر حکومت کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔ یعنی اس دور میں امت تو امتِ واحدہ نہ رہی، لیکن مملکت بہرحال ایک ہی رہی۔ اس کی پوری کوشش یہ تھی کہ ملک میں سیاسی خلفشار یا تفرقہ نہ پیدا ہونے پائے۔ رفتہ رفتہ

مرکزِ ملت کمزور ہوتا گیا اور مختلف ولایات میں آزاد حکومتیں قائم ہوتی چلی گئیں۔ یوں امت، نہ مذہبی طور پر واحد رہی نہ سیاسی طور پر۔ بالفاظِ دیگر جب امت کے ہاتھ سے دین کا دامن چھوٹ گیا تو پھر نہ دین کی وحدت باقی رہی نہ دنیا کی۔ مسلمانوں میں صرف نام کا اشتراک رہ گیا یا مذہب کی بے روح رسوم اور بے جان شعائر و مناسک کا اشتراک۔ لیکن ظاہر ہے کہ نام اور مذہبی رسوم و شعائر کا اشتراک وحدت پیدا نہیں کر سکتا۔ دنیائے عیسائیت کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ساری دنیا کے عیسائی اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہیں اور اپنے مذہب کی رسوم میں حصہ بھی لیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی سلطنتیں الگ الگ ہیں اور وہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار بھی رہتی ہیں۔ ان میں اگر معاہدات بھی ہوتے ہیں تو اسی طرح جیسے کسی غیر عیسائی سلطنت کے ساتھ معاہدہ ہو۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک عیسائی سلطنت اور مسلم سلطنت ایک دوسرے کی حلیف ہوتی ہیں اور وہ دونوں کسی عیسائی یا مسلم سلطنت کے خلاف نبرد آزما۔ دنیا کے مسلمان اِس وقت اس مقام پر ہیں جس مقام پر (مثلاً) عیسائی۔ لیکن عیسائیت کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا کیونکہ ان کا مذہب سیاست میں دخل ہی نہیں دیتا۔ اس کے برعکس، اسلام کا اس سے کچھ بھی نہیں رہتا۔ کیونکہ اس میں مذہب اور سیاست میں ثنویت نہیں۔ اس کا "مذہب" اور "سیاست" دونوں دین کے تابع ہیں اور دین کا اصل الاصول وحدتِ امت ہے۔ ہمارے صدرِ اول میں، اور جن حالات میں ہم اِس وقت گرفتار ہیں، ان میں، ایک بنیادی فرق ہے۔ اُس وقت (جیسا کہ کہا جا چکا ہے) امت بھی واحد تھی اور اس کی مملکت بھی واحد۔ اور جو شخص اسلام لاتا تھا، وہ اُس امتِ واحدہ کا فرد بن جاتا۔ اور مملکتِ واحدہ کا شہری قرار پاتا تھا۔ لیکن آج اگر کوئی شخص اسلام لاتا ہے تو وہ امتِ مسلمہ کا فرد نہیں بنتا، وہ کسی نہ کسی فرقہ کا رکن بنتا ہے۔ نہ ہی وہ مملکتِ اسلامیہ کا شہری قرار پاتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی مسلم ملک کا شہری بنتا ہے۔ ہمارا تفرقہ اور انتشار اِس وقت اس حد تک پہنچ چکا ہے۔

اس افتراق و انتشار سے وحدتِ امت کی طرف عملی قدم اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ مختلف مسلم ممالک اس حقیقت کا اعتراف و اعلان کریں۔ (بالفاظِ دیگر اپنے اس ایمان کا اعلان کریں) کہ وہ "دین کے نقطۂ نگاہ سے" اُسی صورت میں مسلمان بن سکتے اور مسلمان رہ سکتے ہیں جب امت میں وحدت ہو (ہم نے "دین کے نقطۂ نگاہ سے" کا اضافہ اس لئے کیا ہے کہ قومی نقطۂ نگاہ سے ہم سب مسلمان ہی ہیں اور اسی جہت سے موجودہ ممالک کو مسلم ممالک کہہ کر پکارا جاتا ہے) بہرحال، سب سے پہلے اس امر کا اعتراف و اعلان ضروری ہے کہ دین کا تقاضا وحدتِ امت ہے۔ اور آج کے بعد ہمارا ہر قدم اسی نصب العین کی طرف اُٹھے گا۔ یاد رکھئیے، جب تک ہم اُس غلط فہمی یا خود فریبی میں مبتلا رہیں گے کہ اختلاف اور تفرقہ کے باوجود ہم دین کے نقطۂ نگاہ سے بھی مسلمان قرار پا سکتے ہیں، ہمارا کوئی قدم صحیح سمت کی طرف نہیں اُٹھ سکتا۔

اگلا قدم یہ ہے کہ یہ ممالک باہمی معاہدہ کریں (اسے معاہدہ کے بجائے حلف نامہ کہنا زیادہ

صحیح ہوگا) کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کبھی جنگ نہیں کریں گے۔ یہ قرآن کریم کا اولین مطالبہ ہے۔ سورۃ النساء میں ہے کہ اگر کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو عمداً قتل کر دے، اس پر خدا کا غضب اور لعنت ہوگی۔ عذاب عظیم اس کے لئے تیار ہوگا اور وہ سیدھا جہنم میں جائے گا (۴/۹۳) ظاہر ہے کہ جنگ میں ہزاروں مسلمان دوسرے مسلمانوں کے ہاتھوں عمداً قتل ہوتے ہیں، لہٰذا مسلمان ممالک کی باہمی جنگ (از روئے قرآن) دونوں ملکوں کو جہنم رسید کر دیتی ہے۔ سو اس قسم کا معاہدہ (یا حلف نامہ) جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، مسلمان ہونے اور رہنے کے لئے بنیادی شرط ہے۔ یہ معاہدہ کہ یہ ممالک نہ ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کریں گے اور نہ ہی کسی ایسے غیر مسلم ملک کے حلیف ہوں گے جو کسی مسلم ملک کے خلاف نبرد آزما ہو، اُسے سمٹائے ہوئے الفاظ میں یوں کہا جا سکے گا کہ وحدتِ امت کی طرف قدم اول یہ ہونا چاہیئے کہ ان ممالک کی خارجہ پالیسی ایک ہوگی۔ اور جب صورت یہ ہوگی کہ یہ ملک ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہیں کر سکیں گے اور ان سب کی خارجہ پالیسی ایک ہوگی تو ظاہر ہے کہ ان کی دفاع بھی مشترک ہوگی۔

ہمارا زمانہ عصرِ اقتصادیات کہلاتا ہے۔ اس میں فوج سے بھی زیادہ اہم اور مؤثر عنصر اقتصادی پالیسی ہے۔ مسلم ممالک میں قدرتی ذخائر بے انتہا ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ باہمی اشتراک سے ان ذخائر کو استعمالی شکل میں لایا جائے اور پھر یکساں پالیسی کے تحت طلب و رسد سے متعلق معاملات طے کئے جائیں۔ آپ نے دیکھا کہ ان چند ممالک نے تیل کے معاملہ میں متحدہ فیصلہ کیا تو اس سے کس طرح ساری دنیا میں تزلزل واقعہ ہو گیا۔ بڑی بڑی مستحکم مملکتوں کی بنیادیں تک ہل گئیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ آغازِ کار کے لئے یہ ممالک اس قسم کے اقدامات کریں تو اس سے ان میں باہمی اتحاد کی بڑی خوش آئند صورت پیدا ہو جائے گی اور یہی اتحاد آگے چل کر وحدت کی شکل اختیار کر لے گا..... اس کے لئے قانون کی یکسانیت پہلا قدم ہوگا۔ اس وقت بیشتر مسلم ممالک ایسے ہیں جن میں سیکولر نظام رائج ہے (اگرچہ وہ زبان سے اس کا اعتراف نہیں کرتے۔ مثلاً جس طرح ہم سوشلزم کو اسلامی سوشلزم کہہ کر، سیکولر کو دینی بنا کر دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں) اس نظام کے تحت، ضوابطِ قانون کا الگ الگ ہونا فطری امر ہے۔ جن ممالک میں "شرعی قوانین" رائج ہیں، ان میں (سیکولر سے بھی زیادہ) باہمی اختلاف ہے۔ اس لئے کہ جنہیں شرعی قوانین کہا جاتا ہے، وہ فقہی احکام ہوتے ہیں اور فقہ مختلف فرقوں کی الگ الگ ہے۔ وحدتِ قوانین کی بنیادی شرط، سرچشمۂ قوانین کی وحدت ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں مشترک اور واحد سرچشمۂ قوانین، قرآن مجید کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ ہم نے جس طرح پہلے کہا ہے کہ وحدتِ امت کے بغیر، ہم دینی نقطۂ نگاہ سے مسلمان ہو نہیں سکتے، اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ قرآن کریم کو سرچشمۂ قوانین تسلیم کئے بغیر ہم دعوائے اسلام کر نہیں سکتے۔ قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ (۵/۴۴) "جو لوگ قرآن کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔" اور اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو وحدتِ امت اور وحدتِ سرچشمۂ قوانین، لازم و ملزوم ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ایک بین الملی قانونی کمیشن قائم

کیا جائے جو اس قسم کا ضابطۂ قوانین مرتب کرے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان قوانین کی عملی جزئیات میں مختلف ممالک کے مقامی تقاضوں کے مطابق فرق ہو سکتا ہے لیکن بنیادی قوانین تمام ممالک میں مشترک ہوں گے۔ اس سے وحدتِ امت کا نصب العین بس ایک ہی قدم آگے رہ جائے گا۔

اور وہ ایک قدم ہوگا مشترکہ نصابِ تعلیم جس سے آنے والی نسلوں کے دل و نگاہ میں یک رنگی، اور ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی۔ اس نصاب کی بنیاد قرآن ہوگا — اور تاریخ، فقہ، روایات ... سب اسکے تابع ہونگی — یہ وہ نسل ہوگی جو مختلف مسلم مملکتوں کے جداگانہ تشخص سے بلند ہو کر، امتِ واحدہ کی وسیع و عظیم مملکت قائم کرنے کے قابل ہوگی۔ یہ وہ مملکت ہوگی جو دین کی بنیادوں پر قائم ہوگی اور اسلام کے تقاضوں کو پورا کر سکے گی۔ ویسے تو زمانے کے تقاضے بھی الگ الگ (چھوٹی یا کمزور) مملکتوں کو باہمدگر مدغم ہونے کی طرف کشاں کشاں لا رہے ہیں۔ لیکن ان کے اس ادغام و انضمام میں، اور دین کی بنیادوں پر امتِ واحدہ کی مملکتِ واحدہ میں تبدیل ہو جانے میں بڑا فرق ہے۔ اول الذکر ادغام، محض سیاسی اتحاد ہوگا۔ وہ اتحاد جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ تحسبھم جمیعًا و قلوبھم شتّٰی۔ (۵۹/۱۴)۔ تو انہیں متحد خیال کرتا ہے حالانکہ ان کے دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں؛ اور ثانی الذکر اتحاد، وہ ہوگا جس کے متعلق کہا ہے کہ فالّف بین قلوبکم (۳/۱۰۲) اس نے تمہارے دل جوڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

یہ ہے ہماری قرآنی بصیرت کے مطابق وہ عملی طریق کار جو رفتہ رفتہ وحدتِ امت تک منتج ہو سکتا ہے اور جس کی طرف مجوزہ اسلامی کانفرنس کی توجہ منعطف کرانے کی ضرورت ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ہم کس منہ سے اربابِ کانفرنس کی توجہ اس طرف منعطف کرا سکیں گے جب ہماری اپنی حالت یہ ہے کہ ہم اس مختصر سی مملکت کے اندر بھی وحدت (تو ایک طرف اتحاد تک) پیدا نہیں کر سکے، حالانکہ اس مملکت کو حاصل ہی وحدتِ امت کے دعوے کی بنا پر کیا گیا تھا — وہ تو کی نظر یہ کے معنی ہی وحدتِ امت ہیں — اتحاد اور وحدت تو دور کی بات ہے، ہم اس یکانگت تک کو بھی قائم نہیں رکھ سکے جو ہمیں تشکیلِ پاکستان کے وقت حاصل تھی۔ اس کے برعکس، ہم جس خلفشار و انتشار کی لعنت میں گرفتار ہیں اس کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ علاوہ بریں، ہم مختلف مملکتوں کو وحدت کا پیغام کس طرح دے سکیں گے جب ہماری اپنی مملکت دو ٹکڑوں میں بٹ چکی ہے۔

اور جب بات مملکت کے دو ٹکڑوں میں بٹ جانے تک پہنچی تو اس سے ہماری نگاہ کا رخ ایک اور طرف منتقل ہو گیا۔ اخبارات میں یہ خبر بھی گشت لگا رہی ہے کہ شیخ مجیب الرحمان کو بھی مجوزہ کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی جا رہی ہے۔ اس وقت تک اس خبر کی توضیح (یا تردید) سرکاری حلقوں کی طرف سے نہیں ہوئی لیکن اگر اس میں کچھ بھی صداقت ہے تو ہم اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں کہ

اے محمدؐ! گر قیامت را برآری سر ز خاک
سر برآر و ایں قیامت درمیانِ خلق بیں

ہماری آدھی مملکت تو گئی ہی تھی، اس سے عزتِ قومی اور غیرتِ ملی کا بھی جنازہ نکل جائے گا۔ (جیسا کہ ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں) المیہ مشرقی پاکستان کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ملک، مملکتِ پاکستان کا ایک صوبہ تھا جس نے مملکت سے بغاوت کی اور دشمنوں کی مدد (اور اپنوں کی غداری سے) اس بغاوت میں کامیابی حاصل کر کے ایک جداگانہ آزاد مملکت ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ آپ سوچئے کہ اس "مملکت" کے سربراہ کو اس کانفرنس میں شریک کر لینا جس کا مقصد اتحاد بین المسلمین ہو، مضحکہ انگیز اور شرمناک نہیں تو اور کیا ہوگا؟ علاوہ ازیں، اس کا ایک اور پہلو بھی توجہ طلب ہے۔ مجیب کی عادت۔ ذہنیت اور خباثت کا ہم اچھی طرح تجربہ کر چکے ہیں۔ اگر اسے اس کانفرنس میں شریک کر لیا گیا تو کیا معلوم وہ کیا کچھ کہہ دے اور چونکہ ہماری حیثیت میزبان ملک کی ہوگی، ہمارے لئے یہ ممکن نہ ہوگا کہ ہم اُسے کچھ کہہ سکیں۔ ہم رموزِ مملکت سے واقف نہیں لیکن ایک باغیرت پاکستانی کی حیثیت سے ہم اربابِ حل و عقد کی خدمت میں اتنا گزارش کرنا اپنا ملی فریضہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس قسم کی غلطی نہ کریں۔ اس کے نتائج بڑے دُور رس اور عواقب بڑے مضرت رساں ہو سکتے ہیں۔

اور یہی کچھ ہم اس خبر کے پیشِ نظر بھی کہنا چاہتے ہیں جس کی رُو سے کہا جاتا ہے کہ اس کانفرنس میں والیٔ افغانستان، سردار محمدؐ داؤد خان کو بھی دعوتِ شرکت دی جا رہی ہے۔ سردار محمد داؤد خان بیشک ایک مسلم ملک کا سربراہ ہے اور اس حیثیت سے اس کی مجوزہ کانفرنس میں شرکت محلِ نظر نہیں قرار پا سکتی۔ لیکن افغانستان، جو کچھ پاکستان کے خلاف کہہ اور کر رہا ہے ــــ اور کھلے بندوں کر رہا ہے۔ اس کی موجودگی میں داؤد خان صاحب کو شریکِ کانفرنس کر لینا اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑا مارنے کے مرادف ہوگا۔ کیا معلوم وہ کانفرنس میں کیا کچھ کھلے بندوں کہے اور کیا کیا ریشہ دوانیاں کرے! اس کانفرنس میں صرف انہی مسلم ممالک کو دعوتِ شرکت دینی چاہیئے جو اتحاد بین المسلمین کے خواہاں ہوں، اور جن کے پاکستان کے ساتھ قلبی تعلقات ...... ہوں۔ اس سلسلہ میں اگر ہمیں کسی گوشے کی طرف سے کسی قسم کے دباؤ سے بھی انحراف برتنا پڑے، تو برت لینا چاہیئے کہ یہ مقام جہاں بے حد اہم ہے، وہاں اتنا ہی نازک بھی ہے۔

ان گزارشات کے بعد ہم اس دلی آرزو کے ساتھ رخصت ہوتے ہیں کہ یہ کانفرنس اپنے پیشِ نظر مقاصد میں کامیاب ہو، ہمارے ملی اتحاد اور وحدتِ امت کے لئے طائرِ پیش رس ثابت ہو۔ اور مملکتِ پاکستان اس سے کامیاب و سرفراز ابھرے ــــ یارب! ایں آرزوئے من چہ خوش است!

(تحریر نمود ۱۹ر جنوری)

ــــــــ (۞) ــــــــ

بچھڑنے والوں کی یاد

آخرِ شب کے ہم سفر فیضؔ نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی

آج پھر میرا قلم دو دوستوں کی نوحہ گری میں خوں چکاں ہے۔

یہ (غالباً) ۱۹۴۰ء کا واقعہ ہے۔ تحریکِ پاکستان اپنے شباب پر تھی اور طلوعِ اسلام کا چرچا دور دور تک پھیل چکا تھا کہ ایک دن ایک اجنبی ملنے کیلئے آیا۔ سرو قامت، بھرپور جوانی، کھلا ہوا گلابی رنگ، چہرے کے گرد نورِ شرافت کا ہالہ۔ لب و لہجہ ٹھیٹھ پنجابی جس سے وہ خلوص و محبت چھلک چھلک کر باہر آ رہا تھا جو اُس زمانے میں پنجاب کے دیہات کا عام شیوہ تھا۔ یہ تھے موضع احمدیاں تحصیل نارنگ، ضلع شیخوپورہ کے چوہدری لعل خان۔ تحریکِ پاکستان کے فدائی اور قرآن کے شیدائی۔ پہلے دن جو قلبی تعلق پیدا ہوا، آخری دن تک اسی انداز سے قائم رہا۔ وہ اس تعلق کو محبت سے آگے بڑھا کر عقیدت تک لے گئے۔ بہتیرا کہتا رہا کہ اسے محبت تک ہی رکھیے لیکن ہمیشہ جواب دیا کہ آپ کی قرآنی فکر جو کچھ ہمیں دے رہی ہے، اگر قرآنی حد بندی دامن گیر نہ ہوتی تو میں اسے عقیدت سے بھی آگے لے جاتا۔ کوئی تقریب ہوتی۔ وہ کسی نہ کسی عنوان سے موضوعِ گفتگو کو اسی مرکز کی طرف لے آتے اور پھر اس فکر کو ایسے منفرد انداز سے پیش کرتے کہ اہلِ محفل مسحور ہو کر رہ جاتے۔ میں فکری سیاست کا گوشہ نشین، وہ عملی سیاست کے مردِ میدان، کئی مقام ایسے آئے جن میں جنبشِ ابرو کی گنجائش نکل سکتی تھی لیکن کیا مجال جو انہوں نے باہمی تعلقات میں بال برابر بھی فرق آنے دیا ہو۔ اور یہ اس لئے کہ یہ اختلاف طریقِ کار کا ہوتا تھا، اساس و بنیاد کا نہیں ہوتا تھا۔ اور جب اساس و اصول میں یک رنگی ہو اور تعلقات کی بنیاد ہو خلوص پر تو پھر اس قسم کے اختلافات کبھی باعثِ برگشتگیٔ خاطر نہیں ہو سکتے۔ قریب تینتیس سال کا عرصہ اسی "اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ" کی جنت بداماں فضاؤں میں گزرا کہ پچھلے ماہ (دسمبر) میں اچانک خبر ملی کہ چوہدری صاحب حرکتِ قلب بند ہو جانے سے نیند کی حالت میں ابدی نیند سو گئے۔ یہ حسرت عمر بھر رہے گی کہ میں ایسے پیکرِ خلوص و محبت دوست کے جنازہ میں بھی شریک نہ ہو سکا۔

تعزیت کے لئے چوہدری محمد حسن چٹھہ صاحب شیخوپورہ کے ہاں حاضر ہوا کہ میرے نزدیک ایسے دوست کی تعزیت مرحوم کے ایسے ہی قلبی دوست کے ساتھ کی جا سکتی تھی۔ تو انہوں نے ایک ایسی بات سنائی جس سے اس مومنِ صادق کے قلب کا ایک اور گوشہ انتہائی تابانیوں کے ساتھ وجہِ نورانیتِ فکر و نظر بنا۔ انہوں نے کہا کہ چند ماہ پیشتر کی بات ہے، چوہدری صاحب (مرحوم) ایک دوست کے ہاں گئے۔ یونہی برسبیلِ تذکرہ انہوں نے کہا کہ چوہدری صاحب آپ کی صحت ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔ آپ بڑی لمبی عمر پائیں گے۔ چوہدری صاحب نے یہ سنا اور نم آلود آنکھوں سے کہا کہ بھائی! ایسا نہ کہو۔ حضور نبی اکرمؐ کی عمر شریف تریسٹھ سال کی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے ایک دن بھی زیادہ جینا حضورؐ کی شان میں گستاخی ہے۔ میں تریسٹھ سے بھی ایک دن پہلے مرجانا چاہتا ہوں۔ میری یہ آرزو عمر بھر کی ہے ۔۔۔ اور ان کی یہ آرزو پوری ہو گئی۔

کیسی حسین تھی یہ آرزو، اور کیسا خوش نصیب تھا وہ گدازِ محبت جس کی یہ آرزو یوں پوری ہوئی۔

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیرِ عشق یافت مرگے کہ زندگاں بدعا آرزو کنند

طوبیٰ لہٗ وحسن مآب

(۲)

دوسرا دوست کہ جس کی یادیں میرا قلبِ ویراں عمرِ رفتہ کو آواز دے رہا ہے، ان وادیوں میں تو میرا ہمسفر نہیں تھا لیکن ملتِ اسلامیہ کا درد ایک ایسا مستحکم رشتہ تھا جس سے ہم دونوں کے دل باہم گرہ پیوست رہے۔

۱۹۲۶ء کا ذکر ہے کہ مجھے شملہ سے ملازمت کے لئے احکام موصول ہوئے۔ شملہ میرے لئے بالکل نئی جگہ تھا اور وہاں میرا واقف بھی کوئی نہیں تھا۔ میں نے کسی جگہ پڑھا تھا کہ وہاں 'فتح محمد شیفتہ' نامی کوئی صاحب ہیں جو عام طور پر مسلمان ملازمین کی بڑی مدد کرتے ہیں۔ میں نے (بلا تعارف سابقہ) اس نام پر ایک خط لکھ دیا۔ جب میری گاڑی شملہ اسٹیشن پر پہنچی تو ایک صاحب میرا کارڈ ہاتھ میں لئے مجھے تلاش کر رہے تھے۔ وہ شیفتہ صاحب کے فرستادہ رفیق تھے۔ وہ مجھے شیفتہ صاحب کے مکان پر لے گئے۔ انہوں نے دو تین دن تک مجھے اپنے ہاں اس انداز سے ٹھہرایا گویا مدتوں کے دوست ہوں۔ اس کے بعد میرے لئے تمام ضروری انتظامات کر دیئے اور مجھے ایک دن کے لئے بھی کسی قسم کی کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ چند ہی دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ یہ حسنِ سلوک میرے لئے ہی مخصوص نہیں تھا، ہر نو وارد کے لئے ان کا انداز ایسا ہی تھا۔ شیفتہ صاحب آرمی ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ کسی بڑے عہدہ پر نہیں۔ یوں کہیئے کہ ایک سینئر کلرک، اور وہ بھی عارضی۔ لیکن انہوں نے کچھ ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ آرمی ہیڈ کوارٹرز میں ملازمتوں کا شعبہ ان کی تفویض میں تھا۔ اس زمانے میں، دفاتری زندگی میں ہندو مسلمانوں کے ساتھ کیا کچھ کرتے تھے، ہماری نئی نسل اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ لیکن ان کی مخالفتوں کے علی الرغم، شیفتہ صاحب، مسلمان ملازمین کے حقوق کے تحفظ کے لئے شمشیر بران تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد میں سول سیکرٹریٹ میں آگیا اور حسنِ اتفاق کہ سیکرٹریٹ میں مسلمانوں کے تناسب کا شعبہ میری تحویل میں آگیا۔ اس کے بعد آرمی اور سول، دونوں شعبوں میں ہم نے باہمد گر رفاقت سے جو کچھ کیا میں اسکی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ اس سے ایک گونہ خود ستائی کا پہلو بھی نکلتا ہے۔

لیکن ہماری مساعی کا دائرہ دفاتر تک ہی محدود نہ تھا۔ وہاں "انجمن اسلامیہ" کے نام سے ایک تنظیم قائم کر رکھی تھی جو (مقامی) ملتِ اسلامیہ کے مفادات کا مرکز ثقل تھی۔ اس کے زیر اہتمام ایک ہائی سکول اور ایک زنانہ سکول نہایت حسنِ اہتمام سے چل رہا تھا۔ ایک ہال بھی تھا (جس کا نام صندل ہال تھا) اس میں مختلف تقاریب منائی جاتی تھیں ان تقاریب میں عید میلاد النبیؐ حسن و جمال کے ساتھ منائی جاتی تھی اس کی مثال پھر کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔ یہی وہ ہال تھا جس میں محمد علی جناح نے جب وہ پہلے پہل قائداعظم کی حیثیت سے شملہ تشریف لائے ہیں مسلمانوں سے خطاب کیا تھا۔

اتنا ہی نہیں، اس زمانے میں آریہ سماج کا بڑا زور تھا۔ اور وہ بعض اوقات مسلمانوں اور اسلام کے خلاف بڑا دلآزار انداز اختیار کر لیتے تھے۔ موسم گرما میں ہندوستان بھر کے سرکردہ آریہ سماج شملہ آجاتے تھے اور ان کی سرگرمیاں تیز ہو جاتی تھیں۔ تب انجمن اسلامیہ نے وہاں ایسی دھاک بٹھا رکھی تھی کہ ان لوگوں کو کسی قسم کی دریدہ دہنی

کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اس کا سہرا ایک اور ہستی کے سر تھا جو ہم میں بزرگوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ تھے دخان بہادر) حافظ عبدالحکیم (مرحوم) اعلی اللہ مقامہ ۔۔۔ بڑے حوصلہ مند اور جری صاحب دبدبہ و طنطنہ۔ ان کی زیر سرکردگی ہم نے بڑے بڑے معرکے مارے۔ اس آتشِ نمرود میں بے خطر کود نے والوں میں شیفتہ صاحب سرفہرست ہوتے تھے۔

یہ تھے جالندھر کے رہنے والے) چوہدری (دیامیاں) شیخ محمد شیفتہ جن کا اسی ماہ دکراچی میں) نہایت خاموشی سے انتقال ہوگیا۔ وہ دور ختم ہوگیا لیکن بلامبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ آرمی ہیڈ کوارٹرز میں جس قدر مسلمان ملازمین نظر آتے تھے ان میں سے زیادہ نہیں تو کم از کم پچھتر فیصد شیفتہ صاحب کے آوردہ، پروردہ، یا کم از کم زیر بار احسان تھے اور یہ خدمت کچھ کم نہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

بچھڑتے جانیوالوں کا سوگوار

پیر قریب

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ کراچی میں نواب صدیق حسن خان انتقال کر گئے۔ یہ خبر اخباروں کے کسی ایک کونے میں چھپی اور پڑھنے والوں نے اسے غیر متعلقہ سا سمجھ کر اخبار کا ورق الٹ دیا۔ اگر آج قائد اعظم زندہ ہوتے تو مرنے والے کا سوگ، مملکت کی طرف سے سرکاری طور پر منایا جاتا اور پاکستان کا پرچم تین دن تک سرنگوں رہتا۔ ہماری قوم بھی کیا قوم ہے؟ زندہ قوموں میں سربراہانِ مملکت تک، اپنے "گمنام سپاہیوں" کی یادگاروں پر عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں۔ یہاں وہ محسنینِ ملت، ناکامی کی زندگی جیتے اور گمنامی کی موت مرجاتے ہیں جن کی قربانیوں کے صدقہ میں ہمیں یہ مملکت نصیب ہوئی ہے۔

قائد اعظمؒ کے رفقاء میں بہت سی پُرخلوص شخصیتیں تھیں لیکن بعض ایسے بھی تھے جن کا شمار ان کے عقیدت مندوں میں ہوتا ہے۔ نواب صدیق حسن اسی زمرہ کے سروِ چراغاں تھے۔ وہ (ناگپور کے) خاندانی نواب تھے اور مسلم لیگ کے جیشِ رضاکاران کے سپہ سالار۔ لیکن (دیکھنے والوں کا بیان ہے) کہ انہیں قائد اعظمؒ کے سامنے کبھی سر اٹھاتے تو ایک طرف آنکھ اٹھاتے بھی نہ دیکھا گیا۔ وہ زندگی بھر ان کے "باڈی گارڈ" (پاسبان) رہے اور ان کے بعد (مرحوم) نواب زادہ لیاقت علی خان نے بھی انہی کے آغوش میں آخری سانس لیا۔ جذبۂ خدمت گذاری کے علاوہ خوش خلقی بلکہ انکسار، ان کی فطرتِ ثانیہ تھا۔ تحریکِ پاکستان کے سرفروش "سپاہی" اور طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر کے دلدادہ تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس دور میں، جبکہ قائد اعظمؒ کی رفاقت کے بڑے بڑے مدعی یہ کہنے پر اتر آئے ہیں کہ مطالبۂ پاکستان ہندو کی تنگ نظری کا پیدا کردہ تھا، نواب صاحب (مرحوم) نے قائد اعظمؒ کی پیش کردہ اساس کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے!

اُف! اس حسین دور کی درخشندہ نشانیاں کس طرح گمنامی کے پردوں میں چھپتی جارہی ہیں۔ جو مرجاتے ہیں ان کی قبر پر شمع جلانے والا کوئی نہیں۔ جو زندہ ہیں وہ اس کیفیت کی خاموش تصویر کہ ۔۔۔ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو! (ادارہ طلوعِ اسلام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

طلوعِ اسلام کنونشن (نومبر ۱۹۷۰ء)
پرویز صاحب کا خطاب۔

جبر ہے دل اختیار کے ساتھ

(حدود اللہ کا صحیح مفہوم)

صدرِ محترم و عزیزانِ گرامی قدر! اسلام و رحمت۔

علمائے علم الحیات کی تحقیق یہ ہے کہ زندگی اپنے اولین جرثومہ سے (جسے قرآن نے "نفس واحدۃ" کہہ کر پکارا ہے) ارتقاء کی مختلف منازل طے کرتی، آگے بڑھتی چلی آئی، تا آنکہ اس نے پیکرِ حیوانی اختیار کر لیا، اور وہاں سے ایک قدم آگے بڑھی تو لباسِ آدمیت میں جلوہ پیرا ہو گئی۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُم مَّا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِن شَيْءٍ۔ (۶/۳۸) "زمین پر چلنے والے جاندار ہوں یا فضا میں اڑنے والے پرندے، یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا صحیفۂ فطرت اس قدر جامع و مانع ہے کہ اس میں کسی شے کو نظر انداز نہیں کیا گیا"۔ ان محققین نے یہ بھی بتایا ہے کہ کاروانِ حیات کا اندازِ سفر یہ رہا کہ یہ ایک مقام پر ٹھہرا۔ وہاں کچھ عرصہ سستایا، اور پھر اپنی اگلی ارتقائی منزل کے لئے رختِ سفر باندھ لیا۔ اس نئے سفر میں، اس نے جو زائد از ضرورت ساز و یراق تھا اور جس نے اگلے راستے میں محض بوجھ بن جانا تھا، وہیں چھوڑ دیا، اور انہی نقوش و عناصر کو ساتھ لیکر آگے بڑھا جو اس کے ارتقاء میں ممد و معاون ہوتے تھے، قرآنِ کریم نے تخلیقی سلسلہ میں

خدا کا قانونِ تخلیق

خدا کو جو المصور کے ساتھ البارئ کہا ہے۔ (۵۹/۲۴) تو اس کے یہی معنی ہیں یعنی زندگی کو حشو و زوائد سے منزہ کر کے نئی شکل دینے والا۔ قافلۂ زندگی کی انہی منازل کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ۔ (۶/۹۸) (نیز ۱۱/۶) "خالقِ کائنات وہ ہے جس نے تمہاری تخلیق کا آغاز ایک جرثومۂ حیات سے کیا۔ پھر اس جرثومہ نے اپنی ارتقائی منازل طے کرنا شروع کیں، اس طرح کہ وہ کچھ وقت کے لئے ایک منزل میں ٹھہرا، اور اس منزل نے پھر اسے اگلی منزل کے سپرد کر دیا۔ ہم نے یہ تمام قوانین نکھار کر بیان کر دیئے ہیں لیکن انہی کیلئے جو غور و فکر سے کام لیں"۔ اس سارے سفر میں، کچھ نقوش ایسے بھی تھے جنہیں زندگی مسلسل اور متواتر اپنے ساتھ لئے آگے بڑھتی رہی۔ انہیں جانداروں کی جبلی فطرت یا (INSTINCTS) کہا جاتا اور اصولی طور

پر انہیں تین شقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یعنی جذبہ تحفظِ خویش (SELF - PRESERVATION)۔ جذبۂ تغلب خویش (SELF - AGGRESSION) اور جذبہ افزائشِ خویش (SELF - REPRODUCTION)

یعنی زندگی جہاں بھی ہوگی وہ اپنا تحفظ چاہے گی۔ اس تحفظ کے لئے وہ دوسروں پر غلبہ و تسلط رکھنا چاہے گی۔ اور پھر اپنا

زندگی کے بنیادی تقاضے

تسلسل، اپنی نسل کی صورت میں قائم اور باقی رکھے گی۔ یہ زندگی کے بنیادی تقاضے ہیں جنہیں وہ بہرحال پورا کرنا چاہتی ہے۔ وہ انہیں پورا کرنے کے لئے اپنی انتہائی توانائیاں صرف کر دیتی ہے اور جہاں اس میں شکست کھا جاتی ہے، مٹ جاتی ہے۔ یہ سب خدا کے قانون محو و ثبات کے مطابق ہوتا ہے۔ يَمْحُو اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ، وَعِنْدَهٗ اُمُّ الْكِتٰبِ ۔ (۱۳/۳۹) اِس قانون فطرت کے مطابق جس کی اصل و بنیاد علم خداوندی میں ہے۔

زندگی کے یہ تقاضے، ہر نوع (SPECIES) کے ہر فرد کے اندر از خود موجود ہوتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ہر نوع اور اس کا ہر فرد اپنا اپنا تحفظ اور تغلب چاہے گا تو مختلف انواع، اور پھر ایک ہی نوع کے مختلف افراد میں باہمی تصادم ناگزیر ہوگا۔ اس باہمی ٹکراؤ سے زندگی کا پاش پاش ہو جانا لازمی تھا۔ لیکن فطرت تو زندگی کو برقرار رکھنا اور آگے بڑھانا چاہتی ہے۔ اس کے لئے اس نے انتظام یہ کیا کہ ان بنیادی جذبات پر اپنا کنٹرول رکھا۔ یہ اسی کنٹرول کا نتیجہ ہے کہ (مثلاً) شیر جیسا مہیب طاقتوں کا مجسمہ اور درندگی کا ہیکل، بھوکوں مر جائے گا لیکن درخت کے پھلوں اور جنگل کی گھاس کیطرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ اگر شیر پر فطرت کا یہ کنٹرول نہ ہوتا اور وہ تحفظ خویش کے لئے گھاس کو بھی اپنے تصرف میں رکھنا چاہتا تو کوئی چرندہ زندہ ہی نہ رہ سکتا۔ سب بھوکوں مر جاتے۔ پھر یہ بھی فطرت کا کنٹرول ہے کہ ہر نوع کی صلاحیتوں کا الگ الگ دائرہ ہے اور اس کی استعداد کی ایک مقررہ حد۔ اگر شیر سمندر کی گہرائی تک پہنچ سکتا تو کوئی مچھلی (یا بحری جانور) زندہ نہ رہ سکتا، اور اگر بلی کے پر ہوتے تو کوئی پرندہ باقی نہ بچتا۔ یہ فطرت کے ان تحفظات کا نتیجہ ہے جو اس قدر کثیر التعداد انواع اپنے اپنے دوائر میں زندہ ہیں اور بقاء الاصلح کے قانون کے مطابق نشو و نما پاتی رہتی ہیں۔

جب زندگی منزل آدمیت میں پہنچی تو فطرت کے پروگرام کے مطابق، یہ بھی اپنے بنیادی تقاضوں کو ساتھ لے کر

انسان، صاحب اختیار

آئی۔ لیکن اس منزل میں زندگی ایک ایسے انقلاب سے دوچار ہوئی جس سے وہ اس سے پہلے شناسا نہیں تھی۔ یعنی انسان پر سے فطرت نے اپنا کنٹرول اٹھا لیا اور اسے صاحب اختیار و ارادہ بنا دیا گیا۔ اسی جہت سے قرآن نے اسے "ایک دوسری مخلوق" سے تعبیر کیا ہے جب کہا کہ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۔ (۲۳/۱۴) اور یہی وہ تخلیقی انقلاب تھا جس کا ذکر کرتے ہوئے خدا نے اپنے آپ کو احسن الخالقین کہا۔ (۲۳/۱۴)

انسان کے صاحب اختیار و ارادہ ہونے کا مفہوم اتنا ہی نہیں تھا کہ فطرت نے اس پر سے کنٹرول اٹھا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ بھی تھا کہ اس کی فطری صلاحیتوں کے امکانات حدود فراموش اور اس کی استعداد کے دوائر قیود ناآشنا قرار پا گئے۔ اسے قوانین فطرت کا علم حاصل کرکے، اس کی عظیم قوتوں کو مسخر کر لینے کی صلاحیت دی گئی۔ تمام ملائکہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ اسے آلات، اوزار اور ہتھیار بنانے کی استعداد حاصل ہو گئی۔ اسلحہ کا

نتیجہ ہے کہ یہ زمین پر اس تیزی سے چل سکتا ہے کہ تیز سے تیز رفتار جانور اس کی گرد تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ فضا میں اتنی بلندیوں تک اڑ سکتا ہے جو کسی عقاب کے تصور میں بھی نہیں آسکتیں۔ یہ سمندر کی ان گہرائیوں تک پہنچ سکتا ہے، جہاں پانی کی حد ختم ہو جاتی ہے۔

آپ سوچئے کہ اگر کسی نوع کی کیفیت یہ ہو کہ اسے صلاحیتیں ایسی لامحدود اور قوتیں اتنی قیود نا آشنا حاصل ہوں اس کی زندگی کے تقاضے وہی ہوں جو حیوانات کے تقاضے ہیں۔ لیکن اس پر کنٹرول کسی کا نہ ہو، تو اس دنیا کا حشر کیا ہوگا جس میں اس قسم کی مخلوق بستی ہو! انسانی زندگی کی یہی ممکنات اور اسکے اختیارات کی یہی وسعتیں تھیں جن کا تصور کر کے، ملائکہ نے بحضور رب العزت عرض کیا تھا کہ اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ۔ (۲/۳۰) کیا تو اب زمین میں ایسی مخلوق پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جو وہاں فساد برپا کرے گی اور خون بہائے گی؟ تو خود ہی سوچ لے کہ ایسی مخلوق کے ہاتھوں تیری زمین کا کیا حشر ہوگا جس میں یہ مخلوق بسے گی؟ اس کا جواب ان چار لفظوں میں دے دیا گیا کہ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (۲/۳۰) ہم جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔

اس "ہم جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے" کے بعد نگاہ کا رُخ کچھ اس طرف مڑتا ہے کہ خلاق فطرت نے اس نئی مخلوق پر بھی خارجی کنٹرول عائد کر دیا ہوگا۔ لیکن نہیں! یہ خدا کے شایانِ شان نہیں تھا کہ وہ ایک ہاتھ سے انسان کو اسقدر اختیارات دیتا اور دوسرے ہاتھ سے انہیں سلب کر لیتا۔ اس نے ایسا نہیں کیا چنانچہ قصۂ آدمؑ کے تمثیلی بیان میں، انسان کا تعارف ہی ایک صاحب اختیار و ارادہ مخلوق کی حیثیت سے کرایا گیا۔ آدمؑ سے کہا گیا کہ ایسا نہ کرنا۔ اور اس نے اس حکم کی خلاف ورزی کی۔ اُس نے خدا کی معصیت کی۔ اس سے سرکشی برتی۔ ظاہر ہے کہ اس سے کائنات تھرتھرا اٹھی ہوگی مظاہر فطرت پر کپکپی طاری ہو گئی ہوگی، کہ انہوں نے روزِ اوّل سے اُس وقت تک اس قسم کا "حادثہ" کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ کوئی فرمانِ خداوندی کی خلاف ورزی کرے۔ اس سے سرکشی برتے! اس سے عالم لاہوت میں تہلکہ مچ گیا ہوگا۔ شبستان ازل میں حشر برپا ہو گیا ہوگا۔ یہی وہ تحیر انگیز اور محشر خیز منظر تھا جس کی عکاسی اقبالؒ نے ان الفاظ میں کی ہے کہ انسان وجود میں آیا تو

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد۔ حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور۔ خودگرے، خودشکنے، خودنگرے پیدا شد

آدمؑ اپنے اختیارات کے بے محابا استعمال سے، کرنے کو تو ایسا کر گیا لیکن بعد میں جب جذبات میں اعتدال پیدا ہوا تو اسی قانون شکنی کے عواقب کے تصور سے گھبرایا، اور ندامت کے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز سے کہا کہ بارِ الٰہا! کیا ابنِ آدم اسطرح اپنے ہاتھوں آپ تباہ ہو جائے گا، یا اس کے لئے ان تباہیوں سے بچنے کی کوئی صورت بھی ہے! جواب ملا کہ آدم! ان تباہیوں سے بچنے کی ایک صورت تو یہ تھی کہ ابنِ آدم سے اختیار و ارادہ کی قوت چھین لی جاتی اور اسے بھی دیگر اشیائے کائنات، کی طرح مجبور و مقہور بنا دیا جاتا۔ لیکن ہم ایسا نہیں کرنا چاہتے۔ اسکی دوسری صورت یہ ہے کہ ہم ایسی حدود متعین کر دیں جن کے اندر رہتے ہوئے اگر یہ اپنی قوتوں کا استعمال کرے تو اس کا نتیجہ تخریب کے بجائے تعمیر ہو۔ فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (۲/۳۸) اس سے اس کا اختیار و ارادہ بھی باقی رہے گا، کہ جو پابندی کوئی اپنے اوپر آپ عائد کر لے اس سے اس کا اختیار چھن نہیں جاتا۔ تم نے دیکھا نہیں کہ ہم نے، ایسے لامتناہی اقتدارات کا مالک ہوتے ہوئے اپنے اوپر کچھ پابندیاں

آپ عائد کر رکھی ہیں۔ اس سے ہمارے قادرِ مطلق ہونے پر کوئی حرف نہیں آگیا۔ ہم جب کہتے ہیں کہ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ (۲۲/۴۷) یہ ہمارا وعدہ ہے اور ہم اپنے وعدہ کے خلاف کبھی نہیں کریں گے۔ تو یہ کتنی بڑی پابندی ہے جو ہم نے اپنے اوپر عائد کر رکھی ہے۔ لیکن اس سے ہمارے مطلق اختیارات میں کوئی کمی نہیں آگئی۔ لہٰذا، اگر انسان ہماری متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے اختیارات کا استعمال کرے گا تو اس سے اس کے صاحبِ اختیار و ارادہ ہونے کی نفی نہیں ہو جائے گی؛ اور نتیجہ اس کا تباہی اور بربادی کے بجائے تعمیر و تحسین ہو گا۔ اسکی اپنی ذات کی بھی تعمیر و تحسین اور عالمِ انسانیت کی بھی تعمیر و تحسین۔ بلکہ اگر وہ بہ نگاہِ تعمق دیکھے گا تو یہ حقیقت بے نقاب ہو کر اس کے سامنے آجائے گی کہ اس قسم کی (خود عائد کردہ) پابندیوں سے، انسانی اختیارات کی وسعتیں اور بڑھ جاتی ہیں۔ نہر کی ٹھوکر (WEIR) پانی کے بہاؤ کو روکنے کا باعث نہیں، بلکہ اس کی رفتار میں اور تیزی پیدا کرنے کا موجب ہوتی ہے۔ بم کی قوت کا راز اس خول کی سختی میں ہوتا ہے جس کے اندر بارود مقید ہو۔ ہماری متعین کردہ حدود کی پابندیوں سے بھی انسانی اختیارات کی وسعتیں اور اس کی ذات کی قوتیں بڑھ جائیں گی۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ (۲/۲۸۶) ہم یہ پابندیاں متعین ہی اس لئے کرتے ہیں کہ انسانی ذات کی صلاحیتوں میں وسعت پیدا ہو۔ یہ حدود، وحی کی رو سے متعین کی گئیں اور اب اپنی اصلی شکل میں خدا کی آخری کتاب قرآن مجید میں محفوظ ہیں۔ نوعِ انسانی کی ساری تاریخ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے کہ انسان نے جب بھی ان حدود سے انحراف برت کر اپنے جبلی تقاضوں کی تسکین چاہی، اسکا نتیجہ یسفد فی الارض ویسفک الدماء۔ عالمگیر فساد انگیزیوں اور ہولناک خون ریزیوں کے سوا کچھ نہ ہوا۔ اور اس نے جب بھی اپنے اختیارات کا استعمال ان حدود کے اندر رہتے ہوئے کیا۔ زندگی مسکرا اٹھی اور گیسوئے کائنات تابدار سے تابدار تر ہوتے چلے گئے حدود کی پابندی کے بغیر کوئی کھیل بھی کھیلا جائے اس کا نتیجہ فساد ہوتا ہے۔ اگر ہاکی یا فٹ بال کے میدان کی لکیریں مٹا دی جائیں یا کھلاڑیوں کو کھلی چھٹی دے دی جائے، تو کھیل کا میدان، میدانِ جنگ بن جائے گا

حکومت کا نظام

اس مقصد کے لئے کہ انسانوں کے جبلی تقاضے اس طرح پورے ہوں کہ کوئی فرد اپنی حدود سے آگے بڑھ کر دوسروں کے حقوق کو پامال نہ کرے، انسانوں نے حکومت کے ادارہ (INSTITUTION) کی طرح ڈالی۔ مقصد تو اس سے یہ تھا کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے حقوق کو غصب نہ کر سکے، لیکن نتیجہ اس کا اس کے برعکس برآمد ہوا۔ حدود کا تعین اور ان کا نفاذ جن افراد کے سپرد ہوا، وہ خود حدود فراموش ہو گئے۔ ان میں، تحفظِ خویش اور تغلبِ خویش کے جذبہ نے ہوسِ اقتدار کی شکل اختیار کر لی۔ جذبۂ تحفظِ خویش اگر اپنی حد کے اندر رہے تو انسان کو جس وقت اطمینان ہو جائے کہ وہ خطرات سے محفوظ ہے، اس سے اسے تسکین ہو جاتی ہے، لیکن اگر وہ ہر وقت خطرہ محسوس کرتا رہے تو اس سے اس کا ذہنی اور اعصابی توازن بگڑ جاتا ہے۔ وہ دوسرے انسانوں سے خوف کھانے لگ جاتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اسے ان سے خطرہ ہے۔ اس کے لئے وہ انہیں زیادہ سے زیادہ دبا کر رکھنا چاہتا ہے۔ یوں اس کا جذبۂ تغلبِ خویش شدید تر ہو جاتا ہے، اور اسی نسبت سے اس کا ذہنی سکون چھنتا اور توازن بگڑتا چلا جاتا ہے۔ یہ جو آپ تاریخ میں بڑے بڑے جابر اور مستبد حکمرانوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ پاگلوں کی سی حرکتیں کیا کرتے تھے، تو سطحی نگاہ سے اس کی توجیہہ سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن ماہرینِ علم النفس۔

(PSYCHOLOGISTS) مدت العمر کی تحقیق اور تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان جبلّی تقاضوں کی تسکین کو جب بھی حدود سے آگے بڑھا دیا جائے۔ اس سے ذہنی اور اعصابی توازن بگڑ جاتا ہے جو رفتہ رفتہ پاگل

پاگل حکمران

پن تک پہنچ جاتا ہے۔ ہوسِ زر (GREEDINESS) یا ہوسِ شہرت و اقتدار (AMBITION) بُری عادتیں نہیں بلکہ نفسیاتی امراض ہیں اور دیوانگی (INSANITY) کی علامات۔ قرآن کریم نے، نظامِ سرمایہ داری میں ہوسِ زر کے مریضوں کے متعلق کہا ہے کہ ان کی حالت ایسی ہو جاتی ہے۔ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ - (۲/۲۷۵) جیسے انہیں سانپ نے ڈس لیا ہو، اور ہوسِ تغلب میں مبتلا ارباب اقتدار کے متعلق بتایا ہے کہ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً (۲۷/۳۴) وہ جس بستی میں داخل ہوتے ہیں، اسے تہس نہس کر دیتے ہیں اور وہاں کے ہر صاحبِ عزت کو ذلیل کرنے میں لذت لیتے ہیں۔ تو یہ اسی ذہنی اور اعصابی عدم توازن کا پیدا کردہ پاگل پن ہوتا ہے۔ اس بیماری میں ہوتا یہ ہے کہ اس آگ کو جس قدر بجھانے کی کوشش کی جائے یہ اتنی ہی اور بھڑکتی چلی جاتی ہے۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (۱۰۲/۱-۲) حتیٰ کہ انسان قبر کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔ (جذبہ افزائشِ نسل کا ذکر ہم بعد میں کریں گے جس کی حدود فراموش تسکین کو زنا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ بھی اسی طرح پاگل پن کی علامت ہوتا ہے)۔ ان حالات میں، تحفظِ خویش یا تغلبِ خویش کے تقاضوں کی تسکین، مقصود بالذات نہیں رہتی بلکہ دوسروں کو مغلوب رکھنے اور انہیں اذیت پہنچانے سے لذت حاصل ہونے لگ جاتی ہے۔ سائیکلوجی کی اصطلاح میں اسے (SADISTIC TENDENCY) کہا جاتا ہے۔ جس طرح خارش (کھجلی) میں یہ ہوتا ہے کہ جوں جوں کھجاتے جائیے، اس کی لذت، کھجانے کی خواہش کو تیز تر کرتی چلی جاتی ہے، (SADISM) یعنی دوسروں کو اذیت پہنچا کر لذت حاصل کرنے کے مریض کی بھی یہی حالت ہوتی ہے۔ چونکہ اس میں کسی مقام پر جا کر بھی تسکین حاصل نہیں ہوتی۔ اس لئے ایسا مریض ہر وقت غیر مطمئن اور دوسروں کے بالعموم ہو جانے سے خائف رہتا ہے

اذیت رسانی کا مریض

اور اس اذیت رسانی میں اور آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس طرف یہ ہوتا ہے اور دوسری طرف ان لوگوں کی طرف سے جنہیں وہ مغلوب رکھنا چاہتے ہیں، اس استبداد کے خلاف ردِّ عمل شروع ہو جاتا ہے۔ تاریخ انسانیت اس حقیقت کی شاہد ہے کہ مستبد حکمران، دوسروں کو مغلوب تو کر سکتے ہیں، لیکن اس استبداد اور استحصال کے خلاف ان کے دل سے جو ردِّ عمل ابھرتا ہے، اسے روک نہیں سکتے۔ اس لئے کہ تحفظِ خویش کا جذبہ تو اُن کے اندر بھی اُس طرح فطری ہوتا ہے، اور جب وہ اسے پورا ہوتے نہیں دیکھتے تو اس کے خلاف ردِّ عمل لازمی ہوتا ہے۔ اس ردِّ عمل کا نتیجہ، سرکشی ہوتا ہے۔ ان کی اس سرکشی سے، مستبد حکمرانوں کا جذبۂ انتقام ابھرتا ہے۔ ان کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کے مدِ مقابل، صاحبِ اختیار و ارادہ انسان نہ رہیں، مجبور شئیں

(WILL-LESS INSTRUMENTS) بن جائیں جو ان کے اشاروں پر چلتی رہیں۔ قرآن کریم نے استبدادِ فرعون کی اس ٹکنیک کو يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَهُمْ کہہ کر

پکارا ہے۔ یعنی وہ قوم کے اُن افراد کو جن میں جوہرِ مردانگی کی نمود ہوتی، کچل کر رکھ دیتا، اور ان افراد کو آگے بڑھاتا جو اس جوہر سے عاری ہوتے۔ جب معاشرہ میں حکمرانی استبداد عام ہو جائے تو اس سے معاشرہ عجیب قسم کے تباہ کن دائرۃُ السُّوء (VICIOUS CIRCLE) میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ حاکم اور محکوم دونوں ایک دوسرے کی طرف سے خائف رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ عدمِ اعتماد ہوتا ہے اور عدمِ اعتماد کا نتیجہ فساد اور تخریب سے جنون کی تو کسی حد تک تسکین ہو جاتی ہے لیکن فطری تقاضوں کی نہیں۔ فطری تقاضوں کی تسکین، متوازن زندگی ہی میں ممکن ہوتی ہے۔ بغیر متوازن میں نہیں، خواہ یہ عدمِ توازن، جذبات کے بیباک اور حدود فراموش ہو جانے سے پیدا ہو اور خواہ ان کے دبا لیے جانے سے۔ اس عدمِ توازن کو علم النفس میں بدنہادی (PERVERSION) سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن عصرِ حاضر کے، علم تحلیلِ نفسی کے ایک ممتاز ماہر (ERICH FROMM) نے اس کے لئے ایک نہایت خوبصورت اصطلاح وضع کی ہے۔ وہ اسے (UN LIVED LIFE) کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ اپنی کتاب (MAN FOR HIMSELF) میں لکھتا ہے۔

> زندگی کا تقاضا زندہ رہنا اور بڑھنا، پھولنا، پھلنا ہے۔ اگر اس کے اس تقاضا کے راستے میں رکاوٹ پیدا ہو جائے تو اس مسدود توانائی میں ایک تبدیلی واقعہ ہو جاتی ہے اور وہ زندگی کو نشوونما دینے کے بجائے اسے تباہ کر دینے کا موجب بن جاتی ہے۔ یاد رکھیئے، تخریب یا تباہی، (UN-LIVED LIFE) کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ افراد یا معاشرتی حالات جو زندگی کی نشوونما کا راستہ روک کر کھڑے ہو جائیں، تخریب پیدا کرتے ہیں۔ اور تخریب وہ سرچشمہ ہے جس سے شر کے مختلف مظاہر پھوٹتے ہیں۔ (ص ۲۱۵)

میں نے (UN-LIVED LIFE) کی اصطلاح کا ترجمہ نہیں کیا۔ مجھے اس کے ترجمہ کے لئے، اطمینان بخش الفاظ مل نہیں سکے۔ قرآن کریم اس قسم کی کشمکش اور تخریب کو جہنم کی زندگی کہہ کر پکارتا ہے اور اس کے متعلق کہتا ہے کہ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى۔ (۸۷/۱۳) اس میں نہ موت ہوگی نہ زندگی۔ یہ ہے (UN-LIVED LIFE)۔ یہ درحقیقت، زندگی کے اندرونی تقاضوں اور خارجی واقعات کی باہمی کشمکش کا نام ہے۔ یہ کشمکش، مستبد فرماں روا اور مقہور و مغلوب فرماں پذیر، دونوں کے سینوں کو دقفِ اضطراب رکھتی ہے۔ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ۔ (۱۰۴/۶) وہ آگ جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔ دورِ جہالت کا جابر حکمران، اپنے استبداد کو مصلحت کوشیوں کے پردوں میں چھپانے کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا اس لئے وہ اعلانیہ کہتا تھا کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (۷۹/۲۴) میں تمہارا حاکم مطلق ہوں۔ لیکن عصرِ حاضر کا حکمران، جس میں تہذیب و تمدن کا شہرہ اور آزادی کا تصور عام ہو گیا ہے، اس حقیقت کو مختلف اصطلاحوں کے نقاب میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی وہ اپنے اس جنون کو (REVOLUTION) "انقلاب" کہہ کر پکارتا ہے۔ حالانکہ یہ انقلاب نہیں بلکہ سرکشی (REBELLION) ہے۔ یعنی حدود فراموشی ہوتی ہے۔ انقلاب کا سرچشمہ قلب ہوتا ہے، یعنی دلوں

کی تبدیلی، اور (REBELLION) سرسام کا دوسرا نام ہے۔ اور کبھی وہ اسے مفادِ عامہ کی خاطر سلب و نہب سے تعبیر کرتا ہے۔ اپنے استبداد کو اس قسم کی فریب انگیز اصطلاحوں کے نقاب میں چھپانے کی کوشش درحقیقت اس آگ کا دھواں ہوتی ہے جو اس کے سینے کی بھٹی میں بھڑک رہی ہوتی ہے

اور جو اسے کسی پہلو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ اس کی تلوّن مزاجی، اس کی وعدہ فراموشیاں اس کی تضاد بیانیاں، اس کی مجنونانہ حرکتیں سب اس کی اندرونی تڑپ و خلش کے مظاہرے ہوتے ہیں۔

میں نے شروع میں کہا تھا کہ انسانوں نے حکومت کا تصوّر اس لئے پیدا کیا تھا کہ افراد کے جبلّی تقاضوں کی تسکین کے لئے حدود عائد کی جا سکیں، لیکن یہ اس کی حرماں نصیبی اور شوریدہ بختی ہے کہ یہ (تنہا عقل کی رو سے) کوئی ایسا نظامِ حکومت آج تک وضع نہیں کر سکا جو اس مقصد کو پورا کر سکے۔ اس مقصد کو پورا کرنا تو ایک طرف، اسکا وضع کردہ ہر نظام، تعمیر کے بجائے تخریب کا موجب بنتا رہا۔ اس کی ان ناکام کوششوں کی آخری کڑی، نظامِ جمہوریت ہے، جس کا ڈھنڈورا یہ کہہ کر پیٹا جاتا ہے کہ یہ وہ فردوس ہے جسے ابنِ آدم نے کھو دیا تھا اور، صدیوں کی صحرا نوردیوں اور دشت پیمائیوں کے بعد، اب اس نے اسے دوبارہ پا لیا ہے۔ لیکن ابھی یہ نظام چار قدم بھی چلنے نہیں پایا کہ خود اقوامِ مغرب کے مفکرین اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہو رہے ہیں کہ یہ نظام بے حد ناکام رہا ہے۔ شخصی نظامِ حکومت کو اس لئے مردود قرار دیا جاتا تھا کہ اس میں حکمران کے ارادے اور مرضی کو اقتدارِ مطلق حاصل ہوتا تھا یعنی اس پر کوئی حدود عائد نہیں ہوتی تھیں۔ یہی بنیادی نقص نظامِ جمہوریت میں بھی موجود ہے۔ یعنی اس میں بھی برسرِ اقتدار پارٹی کے ارادوں کو اقتدارِ مطلق حاصل ہوتا ہے۔ اس پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ سیاسی اصطلاح میں، اُسے (SOVEREIGNTY) حاصل ہوتی ہے۔ اس اصل کے اعتبار سے، شخصی نظام اور جمہوری نظام میں، کوئی فرق نہیں۔ فرانسیسی مفکر

نظامِ جمہوریت کی ناکامی

(BERTRAND-DE-JOVENEL) اپنی معروف تصنیف میں، جس کا نام ہی (SOVEREIGNTY) ہے، لکھتا ہے کہ:

> پرادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اگر ایک دفعہ آپ اس اصول کو تسلیم کر لیں کہ انسانی مرضی و ارادے کو اقتدارِ مطلق حاصل ہو سکتا ہے تو اس کے بعد جو نظامِ حکومت بھی قائم ہوں گے، حقیقت کے اعتبار سے وہ سب ایک جیسے ہوں گے۔ نظامِ ملوکیت، اور نظامِ جمہوریت بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں، لیکن اس اصول کی رو سے دونوں کا شعوری قالب ایک ہی ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں اقتدار ہو، یہ اصول اسے یکساں حقِ مطلق العنانی عطا کر دیتا ہے[1] (ص ۹۹)

---

[1] میں نے نظامِ جمہوریت کے اسقام و نقائص کو اپنے اس خطاب میں وضاحت سے بیان کیا ہے جسے گذشتہ یومِ آزادی کی تقریب پر پیش کیا تھا اور جو طلوعِ اسلام بابت ستمبر ۱۹۷۳ء میں شائع ہو چکا ہے اسکا عنوان ہے "کیا ہم آزاد ہیں؟"

یعنی اس اصول کے اعتبار سے، شخصی نظام اور جمہوری نظام یکساں ہیں۔ اور جمہوری نظام اس لحاظ سے، اس سے بدتر ہے کہ شخصی نظام میں ایک "پاگل" سے واسطہ پڑتا ہے۔ جمہوری نظام میں سو "پاگل" اکٹھے ہو جاتے ہیں (پاگل سے کیا مراد ہے۔ اسکے متعلق میں پہلے عرض کر چکا ہوں) کہا جائے گا کہ شخصی نظام اور جمہوری نظام میں اس قسم کی مماثلت مغالطہ آفریں ہے۔ جمہوری نظام میں، برسرِ اقتدار پارٹی، اپنے اختیارات پر پابندیاں عائد کرتی ہے۔ ان کا اقتدار بلا حدود نہیں ہوتا۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن ذرا سوچئے کہ جس پارٹی کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ جس قسم کی جی چاہے پابندیاں وضع کرے۔ جب جی چاہے ان میں ردّ و بدل کرے اور جس وقت جی چاہے انہیں توڑ کر پھینک دے، کیا اس کے اختیارات کو محدود اور مقید قرار دیا جائے گا؟ یہ پابندیاں لگیں کب اور کسطرح ہیں، اسے تو کوئی دیدہ ور ہی جان سکتا ہے۔ لیکن کانچ کی ان چوڑیوں کے ٹوٹنے کی کڑکڑاہٹ روز سنائی دیتی ہے۔

بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی نشو و نما اور بہرہ مندی کے لئے ضروری ہے کہ اس کے جبلّی تقاضوں کی تسکین پر پابندیاں عائد ہوں۔ یعنی ایسی حدود جن کے اندر رہتے ہوئے ہر فرد اپنے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اور بات یہاں تک پہنچی کہ فکرِ انسانی آج تک کوئی ایسا نظام نہیں وضع کر سکا جس میں یہ بنیادی مقصد حاصل ہو سکے۔ اس نے جو نظام بھی وضع کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ لوگ یکسر حدود فراموش ہو گئے۔ اور اکثریت کا اسطرح گلا دبا دیا گیا جس سے ان کے یہ تقاضے پورے ہی نہ ہو سکیں۔ یہ انسان کی انتہائی ناکامی ہے اور اس کا نتیجہ مسلسل جہنم۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی تمدنی زندگی کا سب سے اہم اور مشکل ترین مسئلہ (P R O B L E M) یہی یہ ہے کہ اس کے جبلّی تقاضوں (جذبات) پر کس قسم کی پابندیاں عائد کی جائیں۔ ان پابندیوں کے عائد کرنے کا حق کسے حاصل ہے۔ اور انسان ان کی نگہداشت کسطرح کر سکتا ہے۔ انسانی فکر اس اہم ترین مسئلہ کے حل کی تلاش میں سرگرداں چلا آ رہا ہے۔

قرآن نے کہا ہے کہ ایسا فرض کرنا ہی غلط ہے کہ انسانی فکر اس قسم کا نظام وضع کر سکتا ہے جس میں تمام افرادِ انسانیہ کے یہ تقاضے، اسطرح پورے ہوتے چلے جائیں کہ نہ کوئی سرکش ہونے پائے اور نہ ہی مقہور، نہ کوئی حدود فراموشی کے سرسام کی وجہ سے پاگل ہو جائے، اور نہ ہی ایسے آہنی شکنجوں میں جکڑ دیا جائے کہ اس کا دم ہی گھٹ جائے۔ اس نے کہا کہ اس قسم کا نظام، خدا کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔ وہ جو اس نے کہا ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) تو اس سے یہی مراد ہے اور جو اس نے اپنے ضابطۂ ہدایت کو "حدود اللہ" کہہ کر پکارا ہے تو اس سے یہی مفہوم ہے۔ یعنی اس نے واضح طور پر کہا ہے کہ حرام اور حلال مقرر کرنے کی اتھارٹی صرف خدا کو حاصل ہے۔ (۱۶/۱۱۶) اور کسی کو نہیں۔ حتیٰ کہ اپنی ذاتی حیثیت سے رسول کو بھی نہیں (۶۶/۱)۔ فقہ میں تو اسے "مرغی حلال اور کوا حرام" کے مسائل تک محدود کر لیا گیا۔ لیکن اگر اس کی وسعت پر غور کیا جائے تو اس سے مفہوم یہ ہے کہ انسانی آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرنے کی اتھارٹی صرف خدا کو حاصل ہے۔ قائداعظمؒ کے ناقابلِ فراموش الفاظ میں قرآن وہ ضابطۂ ہدایت ہے جو ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتا ہے۔" یہی وہ حقیقت ہے جسے روسی مفکر (D O S T O E V S K I) نے ان چار الفاظ میں نہایت جامعیت سے بیان کر دیا ہے کہ

If there is no God; everything is possible.

یعنی خدا سے انکار کر دیا جائے تو کوئی پابندی ہی باقی نہیں رہتی۔ سب حدود مٹ جاتی ہیں۔ اور اس کا نتیجہ فوضویت (انارکی) کے سوا کچھ نہیں ہوتا جسے قرآن، فساد کہکر پکارتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ (قرآن) اقتدارِ مطلق کسی انسان کو نہیں دیتا۔ اس کا واضح ارشاد ہے کہ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ (۲۱/۲۳) یہ حیثیت صرف خدا کو حاصل ہے کہ وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں۔ (HE IS ACCOUNTABLE TO NONE)۔ انسانوں میں سے کسی کی یہ حیثیت نہیں۔ جو لوگ اس صداقت کو تسلیم کریں، وہ انہیں مومن کہکر پکارتا اور ان کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ الْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ (۹/۱۱۲)۔ حدود اللہ کی حفاظت کرنے والے۔ یہ حدود قرآن کے اندر منضبط ہیں (۹/۹۷)۔ لہٰذا، اسلامی مملکت وہ ہے جو اپنا تمام کاروبار حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے سرانجام دے۔ میری عزیزانِ من! پہلے دن سے یہی پکار تھی کہ اگر آپ کا یہ دعویٰ ہے کہ پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے کے لئے حاصل کیا گیا ہے، تو مملکت کو اس کا اعلان کرنا چاہئے کہ وہ اپنا تمام کاروبار

آئین پاکستان

حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے سرانجام دے گی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس میں میری نوا گری کا کس حد تک دخل تھا لیکن یہ الفاظ "قرار دادِ مقاصد" میں داخل کر دئے گئے" اور اس کے بعد آئین پاکستان میں دہرائے جا رہے ہیں۔ چنانچہ حالیہ آئین (۱۹۷۳ء) کے ابتدائیہ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

> جملہ کائنات پر اقتدار اعلیٰ صرف خدا کو حاصل ہے، اور وہ اختیار جسے اہل پاکستان خدا کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے، استعمال کریں گے، ایک مقدس امانت ہے۔

اس کے علاوہ، اس آئین میں اسلام سے متعلق دو اور شقیں بھی ہیں۔ آئین کے تعارف (آرٹیکل ۲) میں کہا گیا ہے کہ

> پاکستان کا مملکتی مذہب، اسلام ہوگا۔

اور آئین کی دفعہ ۲۲۷ میں کہا گیا ہے کہ

> جملہ رائج الوقت قوانین کو اسلامی احکام کے مطابق مرتب کیا جائے گا جو قرآن پاک اور سنت میں مندرج ہیں۔ اور آئندہ کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو ان احکام سے متصادم ہو۔

جہاں تک اس شق کا تعلق ہے کہ پاکستان کا مملکتی مذہب، یا مملکت پاکستان کا مذہب اسلام ہوگا، ہم واضعین و نافذین آئین، اور ارباب شریعت، دونوں سے بار بار دریافت کر چکے ہیں کہ وہ ان الفاظ کا مفہوم واضح کریں، لیکن کسی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ مذہب انسانوں کا ہوتا ہے، کسی ادارہ کا نہیں۔ اور اسٹیٹ تو درحقیقت کوئی ادارہ بھی نہیں ہوتا۔ یہ ایک سیاسی تصور یا نظریہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ مغرب کے موجودہ نظریہ سیاست نے خدا کو اپنی حدود سے نکال باہر کیا تو انہیں کسی اور معبود کی تلاش ہوئی جو اس کی جگہ لے سکے۔ اس مقصد کے لئے اسٹیٹ کا بت تراشا گیا۔ اسے پہلے، ایک (PERSONALITY) عطا کی گئی اور اس کے بعد اسے معبود قرار دے دیا گیا۔ اب اقوام مغرب کے ہاں اس معبود کی پرستش ہوتی ہے۔ جن لوگوں نے "مملکت

کے مذہب" کا تصور پیش کیا ہے، ان کے تحت، لاشعور میں، مغرب کا یہی نظریہ ہے۔ اقوامِ مغرب کے جمہوری نظام میں اس معبود کو سٹیٹ کہا جاتا ہے اور اشتراکی ممالک میں (PEOPLE) یا عوام، جنہیں، خدا کے بجائے اقتدارِ اعلیٰ کا حامل قرار دیا جاتا ہے۔ قرآن، مملکت کے اس مغربی تصور کو باطل قرار دیتا ہے اس لئے اس نے اپنے ہاں "مملکت" کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ اس نے "خطۂ زمین" میں حکومت" کا ذکر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ وہ حکومت کس قسم کی ہونی چاہیئے۔

جہاں تک اس شق کا تعلق ہے کہ مملکت میں کوئی قانون "کتاب و سنت" کے خلاف نہیں ہو گا ہمارے ارباب شریعت اس امر کا اعتراف و اعلان کر چکے ہیں کہ "کتاب و سنت" کی رو سے کوئی ضابطۂ قوانین ایسا مرتب نہیں کیا جا سکتا ہے جسے جملہ مسلمانانِ پاکستان متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر سکیں۔ مودودی صاحب نے یہ اعتراف، واضح الفاظ میں کیا ہے، در ارباب شریعت میں سے نہ کسی نے اس کی تردید کی ہے اور نہ ہی اس کا دعوےٰ کہ وہ ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کر سکتے ہیں۔

یہ دو شقیں تو یوں ختم ہو گئیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں یہ عقیدہ چلا آرہا ہے کہ قرآن کریم کی بہت سی آیات ایسی ہیں جن کی تلاوت تو کی جاتی ہے، لیکن ان کا حکم منسوخ ہے۔ (بلا تشبیہ) ہمارے آئین کی ان شقوں کی حیثیت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ اور اسے یہ سب جانتے ہیں۔

اب رہی تیسری شق کہ اہلِ پاکستان، اپنے اختیارات کو خدا کی متعین کردہ، حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کریں گے تو یہ شرط دین کی اصل و بنیاد، قرآن کا عروۃ الوثقیٰ، اور اسلامی نظام کا مرکزِ ثقل ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آئین میں کہیں اس کی وضاحت نہیں کی گئی کہ وہ حدود کونسی ہیں، کس جگہ ملیں گی اور ان پر عمل کی شکل کیا ہو گی۔ ظاہر ہے کہ اس صراحت اور وضاحت کے بغیر، اس شق کا مقصد بھی "حصولِ ثواب" سے زیادہ کچھ نہیں رہتا۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ خدا کی مقرر کردہ یہ حدود، اس کی کتاب، قرآن مجید کے اندر موجود و محفوظ ہیں۔ اور مقصد ان سے یہ ہے کہ انسان اپنے جبلّی تقاضوں کی تسکین۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے کرے۔ قرآن کریم میں کچھ متعین احکام ہیں جنہیں اوامر و نواہی یا معروف و منکر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور باقی وہ اقدار ہیں جنہیں اصولی طور پر بیان

حدود اللہ

کیا گیا ہے۔ یہ احکام، اقدار و اصول، سب خدا کی مقرر کردہ حدود ہیں جو غیر متبدل ہیں۔ میرے لئے یہ تو مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے کہ میں ان تمام حدود کو ایک خطاب میں سمیٹ سکوں۔ ان میں سے چند ایک آپ کے سامنے پیش کر سکوں گا۔ ان سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ ان حدود کا مفہوم کیا ہے۔ یہ عمل میں کیسے لائی جا سکتی ہیں۔ اور انسان اگر اپنے اختیار و ارادہ کو ان کے اندر محصور کر لے تو یہ دنیا کیا سے کیا بن جائے۔ انہیں غور سے سنیئے گا۔

اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے، یہ سوال بار بار مرکزِ توجہ رہا کہ اس سلسلۂ زریں کا آغاز کس کڑی سے کیا جائے کہ ان میں سے ہر کڑی اپنی اپنی جگہ یکساں اہمیت کی حامل ہے۔ کافی غور و فکر کے بعد، فٹ بال کے کھیل

کے میدان کی مثال سے (جسے میں پہلے پیش کر چکا ہوں) ایک حقیقت زیادہ نمایاں طور پر میرے سامنے آ گئی۔ اور وہ یہ کہ میدان کے باہر ایک حد ہوتی ہے جسے (BOUNDARY LINE) کہا جاتا ہے۔ اہمیت کے لحاظ سے تو ہر حد یکساں ہوتی ہے لیکن باقی حدود، اس حدالحدود کے اندر ہوتی ہیں۔ چنانچہ میں اس سلسلہ کا آغاز، اسی حدالحدود سے کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ (میری بصیرت کے مطابق) قرآن کی رُو سے بھی اس حد کی یہی پوزیشن سمجھ میں آتی ہے۔ اور وہ حدالحدود ہے احترام آدمیت۔ تکریم انسانیت۔ آپ بنظرِ تعمق

احترامِ آدمیت دیکھیں گے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآنی تعلیم کا مطلوب و مقصود، یہی حد ہے۔ باقی حدود، اسی حد پر متفرع ہیں، اور اسی کو محفوظ رکھنے کا ذریعہ۔ علامہ اقبالؒ نے جب کہا تھا کہ

برتر از گردوں مقام آدم است - اصل تہذیب احترام آدم است

تو "اصل تہذیب" سے ان کا بھی یہی مطلب تھا۔ قرآن کریم نے اس حد کو چار لفظوں میں بیان کر دیا ہے جب کہا کہ:

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ۔ (۱۷/۷۰)

ہم نے ہر انسان، ہر ابن آدم، کو محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم بنایا ہے۔ آپ ان چار لفظی کے اندر مستور حقائق کو کھولتے جائیے اور دیکھئے کہ یہ کسطرح ہر چہار اطرافِ عالم کو محیط ہوتے چلے جاتے اور ساری فضائے کائنات کو اپنے آغوش میں لے لیتے ہیں۔

سب سے پہلے انسانی تخلیق کو لیجئے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، قرآنی تصریحات کی رُو سے، زندگی، حیوانی منازل میں سے گذر کر، وادیٔ انسانیت میں پہنچتی ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر، تخلیق انسانی کے سلسلہ میں، قرآن کریم نے پہلے ان تمام منازل کا تذکرہ کیا ہے جس میں حیوان اور انسان مشترک ہیں۔ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ۔ (۲۳/۱۲) ہم نے انسانی تخلیق کی ابتدا، مٹی کے خلاصہ (بے جان مادہ) سے کی۔ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ۔ پھر ہم نے اسے نطفہ بنایا جو رحم کے اندر ٹھہر گیا۔ اور مادہ کے بیضہ میں قرار گیر ہو گیا۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً۔ پھر اس نطفہ کو علقہ (جونک کی سی شکل میں) تبدیل کیا۔ فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً۔ پھر اس علقہ کو گوشت کا لوتھڑا سا بنا دیا۔ فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا۔ پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچا بنا دیا۔ فَكَسَوْنَا

سلسلۂ تخلیق انسانی الْعِظٰمَ لَحْمًا (۲۳/۱۴) پھر اس ڈھانچے پر گوشت کی تہ چڑھا دی۔ آپ نے دیکھا کہ تخلیق یا تولید کے یہ وہ منازل ہیں جن میں سے ہر حیوانی جنین گزرتا ہے۔ لیکن اس کے بعد، ان دونوں کے راستے جدا ہو جاتے ہیں۔ انسان کے متعلق کہا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ۔ (۲۳/۱۴) اس کے بعد ہم اسے ایک مختلف مخلوق کی ہیئت عطا کر دیتے ہیں۔ اور یہ وہ ہیئت ہے جسے خدا اپنے احسن الخالقین ہونے کی شہادت میں پیش کرتا ہے۔ (۲۳/۱۴) یہاں خدا نے اپنے آپ کو احسن الخالقین کہا ہے، اور دوسری جگہ اپنے اس تخلیقی شاہکار کے متعلق کہا کہ لَقَدْ خَلَقْتُ

الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (۹۵/۴) ہم نے انسان کو حسین ترین (احسن) ہیئت میں پیدا کیا ہے سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا۔ (۱۷/۷۰) ہم نے انسان کو اپنی اکثر مخلوق پر فضیلت عطا کی ہے۔[1]

سوال یہ ہے کہ وہ کیا چیز ہے جس سے انسان، سلسلۂ حیوانات سے متمیز و مختار ہو گیا جس سے اس کی تقویم کو احسن کہا گیا جس سے یہ اس شرف و مجد کا حامل قرار پا گیا؛ قرآن کریم نے اسے ایک اشارہ میں بیان کیا ہے جب کہا کہ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ۔ (۱۵/۲۹) خدا نے اس میں اپنی توانائی کا ایک شمہ پھونک دیا۔ اس "الوہیاتی توانائی" کی کنہ و ماہیت کے متعلق تو قرآن نے کچھ نہیں بتایا۔ البتہ اس سے انسان، اور دیگر جاندار مخلوق میں جو بنیادی فرق پیدا ہو گیا، اسکی صراحت یہ کہکر کر دی کہ اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا۔ (۷۶/۳) ہم نے اسے راستہ دکھا دیا اور پھر اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا کہ وہ چاہے تو اسے اختیار کر لے اور چاہے اس سے انکار کر دے۔ یعنی اس الوہیاتی توانائی کا نتیجہ یہ تھا کہ انسان صاحبِ اختیار و ارادہ مخلوق بن گیا۔ یہ ہے شرفِ انسانیت؛ یعنی اس کا صاحبِ اختیار و ارادہ ہونا۔ قرآن کریم نے انسانی اختیار و ارادہ کے اس محمل کو نفس کہکر پکارا ہے۔ ہم اسے انسانی ذات، خودی، (SELF) یا (PERSONALITY) سے تعبیر کرتے ہیں۔ انسانی نفس (یا ذات) کی دوسری بنیادی خصوصیت اور اہمیت کے متعلق ہم ذرا آگے چل کر بات کریں گے۔ سر دست اتنا سمجھ لینا کافی ہو گا، کہ یہ ذات، ہر انسانی بچے کو، بلا امتیاز، خدا کیطرف سے وہبی طور پر ملتی ہے، اور یہی ہے وہ موہبت عظمیٰ جس کی بناء پر کہا گیا ہے کہ وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) ہم نے ہر انسانی بچے کو یکساں طور پر واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ یہی وہ اساسی خصوصیت ہے جس کی بنیاد پر قرآن، مساواتِ انسانیہ کی عمارت استوار کرتا ہے۔ اور یہ ہے وہ سب سے پہلی اور بنیادی حد جسے ہیں نے انسانی ہیئت اجتماعیہ، اس کے نظم، تہذیب و تمدن، اور اس کی معاشرتی سیاسی، معاشی، زندگی کے لئے حد الحدود یا (BOUNDARY LINE) سے تعبیر کیا ہے۔ اس حد کا عملی مفہوم یہ ہے کہ کوئی ایسا آئین، قانون، ضابطہ، مسلک یا نظریہ یا عقیدہ، جس سے ایک انسانی بچے اور دوسرے بچے۔ ایک فرد اور دوسرے فرد میں، کسی اضافی نسبت سے، کسی قسم کی تفریق کی جائے۔ اس حد کی خلاف ورزی ہو گی، اور کوئی ایسا انداز، کوئی ایسی حرکت جس سے کسی انسان کی توہین و تذلیل ہو، اس حد سے تجاوز قرار پائے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ معاشرہ میں مختلف مدارج و مراتب ہوں گے لیکن ان کا معیار جوہر ذاتی یا پاکیزگی سیرت و کردار ہو گا۔ نہ کوئی اضافی نسبت۔ اختلافِ مدارج کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ

---

[1] یہ جو ہم اپنے آپ کو "اشرف المخلوقات" کہتے ہیں تو قرآن کی رُو سے یہ صحیح نہیں۔ انسان، تمام مخلوق سے اشرف نہیں۔ اکثر مخلوق سے اشرف و افضل ہے۔ ہم خدا کی تمام مخلوق کا احاطہ ہی نہیں کر سکتے۔ کیا معلوم کہ کائنات کی ان لاانتہا پہنائیوں میں کس کس قسم کی مخلوق ہے۔ قرآن کریم نے اتنا ہی اشارہ کیا ہے کہ زمین اور اجرام سماوی دونوں میں جاندار مخلوق ہے۔ اور اس کے بعد یہ کہ ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ اس مخلوق کو ایک دن آپس میں ملا دیں (۴۲/۲۹)۔ ہمارے زمانے میں چاند اور مریخ تک کی پروازیں شاید اسی سلسلہ کی ابتدا ہو!

بکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا - (۴۶/۱۹) درجات کے تعیّن کا معیار اعمالِ انسانی ہوگا۔ اور اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ - (۴۹/۱۳) اور سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہوگا جس کی سیرت سب سے بلند اور پاکیزہ ہوگی۔

اختلافِ مدارج

لیکن اس اختلافِ مدارج کے معنی یہ نہیں کہ جو لوگ مدارج میں نیچے ہوں گے، انہیں بنظرِ حقارت دیکھا جائے گا۔ قطعاً نہیں۔ قرآن نے تکریمِ انسانیت کی بنیاد انسانی ذات کو قرار دیا ہے جو ہر انسان میں یکساں طور پر موجود ہے۔ لہٰذا، کسی انسان کی توہین و تحقیر کے کیا معنی؟ انسان کی توہین تو خدا بھی نہیں کرتا۔ آپ دیکھئے کہ اس عظیم حقیقت کو قرآن نے کس قدر لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ سورہ الفجر میں ہے کہ انسان پر جب تنگی آتی ہے تو وہ شکایت کرتا ہے۔ رَبِّیْۤ اَهَانَنِ (۸۹/۱۶) خدا نے مجھے یونہی ذلیل کر دیا۔ ادھر سے فوراً جواب ملتا ہے کہ یہ غلط ہے کہ خدا نے تمہیں یونہی ذلیل کر دیا۔ بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ - (۸۹/۱۷) تم اس لئے ذلیل ہوئے ہو کہ تم نے معاشرہ ایسا قائم کیا جس میں ذلت اور عزت کے معیار بدل گئے۔ اس میں عزت اس شخص کی ہونے لگی جس کی پارٹی یا جتھہ طاقتور ہو۔ جو شخص معاشرہ میں تنہا رہ جائے اس کی کوئی عزت نہیں کرتا۔ لہٰذا تم جو شکایت کر رہے ہو کہ تم ذلیل ہو گئے ہو تو خدا نے ایسا نہیں کیا۔ تمہارے معاشرہ نے خدا کی متعیّن کردہ حدود کو پامال کر دیا ہے۔ خدا کی متعینہ حد یہ تھی کہ ہر انسان، انسان ہونے کی جہت سے یکساں عزت اور تکریم کا مستحق ہے۔ یہ معیار غیر متبدل تھا، اس لئے اس کی رُو سے ہر انسان کو اس کا اطمینان حاصل تھا کہ خارجی حالات کچھ بھی ہوں، میری وہ عزت جو مجھے انسان ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے، مجھ سے کوئی نہیں چھین سکے گا۔ لیکن جب عزت و تکریم وابستہ ہو گئی خارجی حالات سے، تو یہ حالات بدلتے رہتے ہیں، اس لئے اس معاشرہ میں آج کا معزز، کل کا ذلیل، اور کل کا ذلیل، آج معزز سمجھا جائے گا۔ اس کا ذمہ دار خدا کو نہ ٹھہراؤ۔ اپنے غلط معاشرہ اور اسکے خودساختہ معیاروں کو قرار دو!

قرآن اس باب میں اس حد تک آگے جاتا ہے کہ وہ مجرم کو اس کے جرم کی سزا تو دیتا ہے لیکن اس کی تذلیل و تحقیر نہیں کرتا۔ جو عزت اسے بہ حیثیت انسان حاصل تھی، اُس سے وہ نہیں چھینتا۔ آپ دیکھئے کہ خدا مجرمین کو کس پیار سے بلاتا ہے جب کہتا ہے کہ قُلْ يٰعِبَادِیَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (۳۹/۵۳) اے میرے بندو! جو اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھے ہو، میری رحمت سے ناامید مت ہو۔ وہ (خدا) جہنم میں جانے والوں کے متعلق بھی ایک مشفق و جانسوز ہمدرد کی طرح، "بصد حسرت و تاسف" کہتا ہے کہ يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ - (۳۶/۳۰)۔ وائے، اے میرے بندو (تم نے اپنے آپ سے یہ کر دیا)۔

مجرم کو بھی بنظرِ حقارت نہ دیکھو

وہ مجرموں کو بھی "میرے بندے" کہہ کر پکارتا ہے کہ ارتکابِ جرم کی غلطی اور لغزش سے، انکی انسانیت ان سے نہیں چھن گئی، لہٰذا انسان ہونے کی حیثیت سے وہ جس عزت و توقیر کے مستحق تھے، ان کی وہ حیثیت بہرحال و بہرحیث قائم اور دائم رہتی ہے۔

انسان اور انسان کا سنگین ترین تفاوت، حاکم و محکوم کی تفریق کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ

چکے ہیں، انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت، اختیار و ارادہ ہے، اور حاکم و محکوم کی تفریق کا میدان وہ ہے جہاں

حاکم و محکوم کا تفاوت

ایک فرد کا اختیار و ارادہ دوسرے فرد کے اختیار و ارادہ سے ٹکراتا ہے۔ انسانی فکر نے بڑی کوشش کی ہے کہ حاکم و محکوم کی تفریق مٹا دی جائے، لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کی اس کوشش کی آخری کڑی جمہوری نظام ہے لیکن جیسا کہ اب جمہوری نظام کے مدعیوں کو خود اعتراف ہے۔ اس نظام سے بھی وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکا۔ یہ تفریق بدستور باقی ہے فرانسیسی مفکر "بینی گوئن" کے الفاظ میں:

> اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ اس میں لوگ اپنی حکومت آپ قائم کرتے ہیں، تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی تھی، اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ اس میں جو لوگ برسر اقتدار آ جاتے ہیں، ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دل میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ ان پر کوئی حاکم نہیں۔ وہ اپنے حاکم آپ ہیں۔ یعنی حکومت عوام کی ہے۔

(THE CRISIS OF MODERN WORLD. P. 106)

لہٰذا، حاکم و محکوم ایک سطح پر نہ پہلے کبھی آئے تھے، نہ اب آ سکے ہیں۔ برسر اقتدار طبقے نے، اپنے آپ کو ہمیشہ بلند و بالا سمجھا اور محکوموں کو بنظر حقارت دیکھا ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ، خدا کا پیغام لیکر فرعون کے پاس گئے ہیں تو اس نے یہ کہہ کر ان کی بات سننے سے انکار کر دیا تھا کہ قَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ۔ (۲۳/۴۷)۔ یہ ہماری محکوم قوم کے افراد ہیں اس لئے ان کی بات سننے کے قابل کیسے ہو سکتی ہے؟ جو بات تین چار ہزار سال پہلے فرعون نے کہی تھی، اسکی صدائے بازگشت آج بھی ہر ایوان حکومت سے برابر سنائی دیتی ہے خواہ اس کے الفاظ کتنے ہی بدلے ہوئے کیوں نہ ہوں۔ یہی وہ احساس تفاخر تھا جس سے جھلا کر مارکس نے کہا تھا کہ جب تک دنیا میں حکومت کا ادارہ باقی ہے، انسانی طبقات کی تفریق ختم نہیں ہو سکتی۔ بات تو اس نے ٹھیک سمجھی تھی لیکن وہ بتا سکا نہ اس کے متبعین کہ اس تصور کو عمل میں لانے کی صورت کیا ہو سکتی ہے! یہ صورت آج سے چودہ سو سال پہلے قرآن نے بتائی تھی۔ اس نے کہا کہ حکومت کے ادارہ کا وجود تو بہر حال باقی رہے گا کیونکہ اس کے بغیر انسانی معاشرہ میں انارکی پھیل جائے گی، لیکن اس میں حاکم اور محکوم کی تفریق باقی نہیں رہیگی۔ اس تفریق کو مٹانے کے لئے اس نے اعلان کیا کہ۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (۳/۷۹)۔ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اسے ضابطہ قوانین، نظام حکومت، یا نبوت تک بھی کیوں نہ مل جائے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم میرے محکوم بن جاؤ۔ اس سے اس نے حاکم و محکوم کا تصور ختم کر دیا۔ اس کے بعد سوال پیدا ہوا کہ پھر نظام حکومت کی صورت کیا ہوگی۔ اس کے لئے اس نے کہا کہ اس نظام کا فریضہ صرف ان حدود کی پابندی کرانا ہوگا، جو (کسی انسان کی نہیں بلکہ) خدا کی متعین کردہ اور غیر متبدل ہیں۔ چنانچہ اس آیت کا اگلا حصہ یہ ہے کہ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ

وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۔ (۳/۷۹) ہے یہی کہنا چاہیے کہ تم اس کتاب کی رو سے جسے تم پڑھتے پڑھاتے اور سمجھتے سمجھاتے ہو، ربّانی بن جاؤ۔ اسی کا نام حکومت خداوندی ہے۔ اس مقام پر قرآن ایک ایسا لطیف اور عمیق نکتہ سامنے لاتا ہے کہ جوں جوں نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، انسان وجد میں آجاتا ہے۔ اس نے اس نظام حکومت کے مرکز اوّل، رسول اللہ کی اطاعت کو لازمی قرار دیا ہے۔ اسی سے، مطاع اور مطیع، یعنی حاکم و محکوم، غلام اور آقا، کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے بتایا ہے کہ رسول کی حیثیت ایک معلّم (استاد) کی تھی۔ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۔ (۶۲/۲) یعنی اس نظام میں مطاع اور مطیع کا رشتہ، حاکم و محکوم یا غلام اور آقا کا نہیں، بلکہ استاد اور شاگرد کا ہوگا۔ ان ہر دو نوعیتوں کے رشتہ کا فرق

شاگرد اور استاد کا رشتہ

اس مشکل ترین مسئلہ کو نہایت آسانی سے حل کر دیتا ہے۔ انصارؓ، حاکم و محکوم اور استاد اور شاگرد، دونوں رشتوں میں ہوتی ہے۔ احکام اور ان کی اطاعت بھی ان دونوں میں ہوتی ہے۔ لیکن دونوں کے مقصد و منتہیٰ میں زمین، آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ حاکم یا آقا کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے غلام، ملازم یا محکوم کا زیادہ سے زیادہ استحصال (EXPLOIT) کرے۔ وہ اسے اپنے مقاصد کے بروئے کار لانے کا ذریعہ سمجھتا ہے اور اس سے اپنے احکام کی اطاعت اس لئے کراتا ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ حاصل اور وصول کرے۔ محکوم یا غلام ان احکام کی اطاعت مجبوراً کرتا ہے اور ہر وقت اس کوشش میں رہتا ہے کہ اپنے آقا سے جان چھڑا کر بھاگ جائے۔

اس کے برعکس، استاد کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے علم کا زیادہ سے زیادہ حصہ، شاگرد کو دیتا جائے۔ اپنی قابلیت کو زیادہ سے زیادہ شاگرد کے بننے میں انڈیلتا جائے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ قابل ہو جائے۔ وہ شاگرد کی کامیابی میں اپنی کامیابی اور اس کی ناکامی میں اپنی ناکامی دیکھتا ہے وہ شاگرد سے اپنے احکام و ہدایات کی اطاعت اس لئے کراتا ہے کہ اس طرح اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو جائے۔ چنانچہ قرآن کریم نے يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ کی غایت يُزَكِّيْهِمْ بتائی ہے (۶۲/۲) یعنی وہ تعلیم کتاب و حکمت سے ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کر دے۔ یہ ہے حاکم و محکوم کے تعلق کی مثال، قرآنی نظام حکومت میں۔ یعنی شاگرد اور استاد کا تعلق، نہ کہ آقا اور غلام کا رشتہ انصارؓ کا تصور دونوں میں ہوتا ہے، لیکن اس کی غایت ایک دوسرے سے یکسر مختلف بلکہ متضاد ہوتی ہے۔ اس طرح قرآن، نظام حکومت کو باقی رکھتے ہوئے، حاکم و محکوم کی تفریق مٹا دیتا ہے۔ وہ ان دونوں کے تعلق کی نوعیت بدل دیتا ہے۔ ان دونوں رشتوں کی نوعیت کا یہی وہ فرق ہے جس کے پیش نظر (ERICH FROMM) ڈیماکریسی اور فاشزم کا فرق ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ:

> ڈیماکریسی اس نظام کا نام ہے جو اس قسم کے اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی حالات پیدا کرے جن میں ہر فرد کی مضمر صلاحیتیں عملی طور پر نشوونما حاصل کر سکیں۔ اس کے برعکس فاشزم کا نظام اسے کہیں گے (خواہ اس کا نام کچھ بھی کیوں نہ رکھ لیا جائے) جس میں فرد کو خارجی مقاصد کے حصول کا آلۂ کار بنا دیا جائے اور اس کی انفرادیت کی نشوونما کرنے سے کمزور تر ہوتی جائے۔ (ESCAPE FROM FREEDOM. P.801)

وہ دوسرے مقام پر لکھتا ہے کہ:

ایسی سیاسی آزادی جس میں انسان کو سطحِ انسانیت سے گرا دیا جائے جس میں اسے (DE - HUMANISE) کر دیا جائے۔ آزادی نہیں رہتی، غلامی بن جاتی ہے۔

(THE REVOLUTION OF HOPE. P. 91)

یہی وہ، (اقبال کے الفاظ میں) "انسان کو حیوان بنانے کا طریق" ہے۔ جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ - ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ - (۹۵/۴-۵) اس میں انسان احسن تقویم کے بلند ترین مقام سے گر کر، اسفل سافلین کی پست ترین سطح پر آجاتا ہے۔ دوسرے مقام پر ہے۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ (۷/۱۷۶) ہم تو چاہتے تھے کہ یہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جائے لیکن یہ (اپنے بنائے ہوئے زنداں میں محبوس ہو کر) زمین کی پستیوں سے چمٹ جاتا ہے۔ یہ "آسمان کی بلندیاں" اس ماحول میں حاصل ہو سکتی ہیں جس میں کسی فرد کی (عملاً تو ایک طرف) اشارۃً اور کنایۃً بھی کسی قسم کی تحقیر و تذلیل نہ ہو۔ کوئی اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلہ میں پست اور حقیر محسوس نہ کرے، اور جس طرف جائے۔ آدمیت احترامِ آدمی کی جنت گنگا، نشیدِ حریت افروز اس کا استقبال کرے۔ یہ صرف اس ماحول میں ممکن ہے جس میں کیفیت یہ ہو کہ

کس دریں جا سائل و محروم نیست ۔ عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

روٹی کا مسئلہ

"سائل و محروم" کی بات آگئی تو اس سے وہ چٹان سامنے آگئی جس سے ٹکرا کر، احترامِ آدمیت کی کشتی پاش پاش ہو جاتی ہے۔ یعنی روٹی کا مسئلہ۔ اس میدان میں اگر حدود اللہ کو مٹا دیا جائے، تو اس سے جس قسم کی تذلیلِ انسانیت ظہور میں آتی ہے اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ یہ بھوک ہے جس سے اس قدر مہیب و عظیم قوتوں کے مالک، شیر کو، سرکس کا رنگ ماسٹر، بندر کی طرح نچاتا ہے۔ وہ تو اسے نچاتا ہی ہے لیکن انسانوں کا بالادست طبقہ، حدود اللہ سے سرکشی، بدت کر، رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں لیکر، جو کچھ زیردست محتاج انسانوں سے کراتا ہے۔ وہ کسی حیوان کے تصور میں بھی نہیں آسکتا۔ اس میدان میں بھی قرآن کریم احترامِ آدمیت کے تحفظ کے لئے وہی حد بندی کرتا ہے جو اس نے حاکم و محکوم کی تفریق مٹانے کے سلسلہ میں کی تھی یعنی اس نے جس طرح انسانوں کے ہاتھ سے حقِ حکومت چھین کر، اسے خدا کے ہاتھ میں دے دیا، اسی طرح اس نے رزق کے سرچشموں کو بھی یہ کہہ کر انسانوں کے حیطۂ اقتدار سے چھین لیا کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)

تمہیں اور تمہاری اولاد کو رزق ہماری طرف سے ملے گا۔

اس ایک حد بندی نے اس سب سے بڑے حربہ کو مسدود ہی نہیں، معدوم کر دیا، جس سے بالادست انسان، زیردستوں کو محتاج و محکوم بناتے اور ذلیل و خوار کرتے تھے۔ فرعون کی فرعونیت اس دعوے پر تھی کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى۔ (۷۹/۲۴)۔ ہم تمہارے "اَنْ داتا" ہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ کہ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ۔ (۴۳/۵۱) اس ملک میں اقتدار میرا ہے۔ اسکی زمین میری ملکیت ہے۔ اس

میں بہنے والی نہریں میرے قبضے میں ہیں۔ رزق کے ان سرچشموں پر میرا کُلی اختیار و اقتدار ہے، اس لئے تم سب میرے محتاج اور محکوم ہو۔ فرعون، عزیزانِ من! کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں۔ اقتدار و اختیار جب بھی انسانوں کے ہاتھ میں آئے گا، وہ رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں لے لیں گے اور اس طرح ان میں سے ہر ایک فرعون بن جائے گا۔ میں قرآن کے معاشی نظام کے متعلق اسقدر بکثرت اور شرح و بسط سے لکھ چکا ہوں کہ اس مقام پر اس کی تفصیل میں جانا ضروری نہیں سمجھتا۔ بنیاد اس سارے نظام کی، یا یوں کہئے کہ مقصود و منتہیٰ اس نظام کا یہ ہے کہ رزق کی احتیاج سے کسی انسان کی عزتِ نفس کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔ نظامِ حکومت کا فریضہ خدا کے عطا کردہ رزق کی اسطرح تقسیم ہو کہ کسی فرد کی ضرورت رکنے نہ پائے۔ اور اس کے حصولِ رزق کا یہ حق، کسی شرط سے مشروط نہ ہو، بلکہ رزق کی تقسیم کرنے والے ان سے برملا کہیں کہ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا - (۷۶/۹) اس کا تم سے معاوضہ یا بدلہ لینا تو ایک طرف، ہم اسکے لئے تمہاری طرف سے کسی شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں۔ بدلہ یا شکریہ کا سوال اس صورت میں پیدا ہو جب ہم نے تمہیں اپنی طرف سے کچھ دیا ہو۔ یہ رزق، تمہارے رازق کیطرف سے عطا ہوا ہے۔ ہم تو اس کے صرف قاسم (تقسیم کرنے والے) ہیں، اسی طرح، جیسے پوسٹ مین، منی آرڈرز کا روپیہ تقسیم کر دیتا ہے۔

لیکن قرآنِ کریم عطائے رزق کے سلسلہ میں جو لِم اور غایت بتاتا ہے، اس کی وضاحت کے لئے تقسیم کی یہ تشبیہ بھی ناقص رہ جاتی ہے۔ جسطرح اس نے نظامِ حکومت کے ضمن میں، حاکم و محکوم کا رشتہ، استاد اور شاگرد کا سا بتایا تھا اسی طرح وہ نظامِ رزق میں بھی رازق و مرزوق کا ایسا رشتہ بتاتا ہے جس میں صلہ اور شکریہ کا احساس تک پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس نے اسبابِ رزق (بارش وغیرہ) کو خدا کی رحمت کہکر پکارا ہے۔ (۲۵/۴۸ - وغیرہ) اور ربوبیتِ عالمین کو اس کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت کی مظہر۔ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ کے بعد الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ (۱/۲) کے الفاظ، اسی حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ رحمۃ یا رحمٰن و رحیم کا مادہ (ر-ح-م) ہے جسکے اولین معانی رحمِ مادر کے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے، رزق دینے والے اور رزق لینے والے کا باہمی

ماں اور بچے کا رشتہ

رشتہ ماں اور بچے کا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ اس رشتہ سے مفہوم و مقصود کیا ہے۔ ماں اپنے رحم میں، جنین کی پرورش اپنے خونِ جگر سے کرتی ہے اور اس سے اس کے دل میں کسی معاوضہ یا شکریہ کا احساس تک نہیں پیدا ہوتا۔ اس کی انتہائی خواہش، کوشش اور خوشی اس میں ہوتی ہے کہ جنین، رحم میں پرورش پاکر تندرست و توانا بچے کی صورت میں دنیا میں آئے۔ پیدائش کے بعد، وہ بچے کی پرورش پھر اپنے خونِ جگر سے کرتی ہے اور اس میں بھی اس کی انتہائی خواہش اور کوشش یہی ہوتی ہے کہ بچہ کی صلاحیتیں اسطرح نشو و نما پا جائیں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو جائے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ جب بچہ پہلے پہل دو قدم چلنے کے قابل ہوتا ہے تو ماں کا دل کسطرح خوشی سے بلیّوں اچھلنے لگتا ہے اور وہ کس طرح انتہائی فخر و مسرت سے دوسروں سے کہتی ہے کہ دیکھو! میرا بچہ چلنے لگ گیا ہے! بچوں کی سالگرہ کی تقریبیں، ماں کے اسی جذبہ فخر و مسرت کی مظہر ہوتی ہیں، حالانکہ غور سے دیکھئے تو بچہ جوں جوں بڑا ہوتا جاتا ہے۔ ماں کی احتیاج سے آزاد ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اسی میں تو ماں کی محبت کا راز پنہاں ہے۔ وہ اپنے بچے کو محتاج نہیں، آزاد دیکھنا چاہتی ہے[1] خدائے

---

[1] فٹ نوٹ اگلے صفحہ کے نیچے ملاحظہ فرمائیں

رحمٰن و رحیم بھی ربوبیت عالمینؔ سے یہی چاہتا ہے کہ انسان، محتاج نہ رہے، زیادہ سے زیادہ آزاد ہوتا جائے۔ یہ وجہ ہے جو اس نے، اس پرورش کے سلسلہ میں اپنا اور انسانوں کا رشتہ، رحمانیت، (MOTHERLY LOVE) کا بتایا ہے۔ باپ اور بیٹے کا نہیں بتایا کہ اس رشتے سے وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ ہے رشتہ اس نظام کا، جس کے ہاتھوں رزق کی تقسیم ہوتی ہے، اور افراد معاشرہ کا یعنی ماں اور بچے کا رشتہ۔ جسطرح ماں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنے بچے کو دودھ پلا کر، نہ اسے محتاج سمجھتی ہے نہ ذلیل۔ نہ بچے سے اسکا معاوضہ طلب کرتی ہے۔ نہ صلہ۔ نہ اس کے لئے اسے ستائش کی تمنا ہوتی ہے نہ شکریہ کی آرزو۔ اسی طرح حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے رزق تقسیم کرنے والوں کی بھی یہی حالت ہوتی ہے۔

اس کے برعکس، اس معاشی نظام میں، جس میں اقتدار انسانوں کے ہاتھ میں ہو، ارباب اقتدار اور عوام کا رشتہ قصاب اور اس کے بکرے، یا تانگے والے اور اس کے گھوڑے کا سا ہوتا ہے۔ اور اگر آپ اس میں "ثواب" کا پہلو بھی دیکھنا چاہیں، تو اس رشتے کو ایسا سمجھئے جیسا اس دنبے اور اس کے مالک کا رشتہ جسے وہ قربانی دینے کیلئے پال رہا ہو۔ اس میں بکرے، گھوڑے یا دنبے کی پرورش، ان جانوروں کی خاطر نہیں ہوتی۔ اس لئے ہوتی ہے کہ اس سے وہ جانور، ان کے مالکوں کے مقاصد بروئے کار لانے کے قابل رہیں۔ اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہر انسانی ذات، اپنا مقصد آپ ہوتی ہے۔ جب کوئی ذات، کسی دوسری ذات کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بن جائے، وہ ذلیل و خوار ہو جاتی ہے۔ اس میں شرف انسانیت باقی نہیں رہتا۔ پندار نفس کی اس شکست کا وہ ردعمل ہوتا ہے جو معاشرہ کے زیردستوں کیطرف سے سرکشی اور بغاوت کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ کوئی ذات اپنی ذلت برداشت نہیں کر سکتی۔ معاشرہ تو ایک طرف، جس دن کوئی ماں باپ اپنے جوان بیٹے سے کسی بات پر ناراض ہو کر یہ کہدے کہ کیا ہم نے تمہیں اسی دن کے لئے پالا پوسا تھا، اس کے دل سے ان کا احترام ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے لئے یہ احساس بڑا اذیت رساں ہوتا ہے کہ میں، کسی دوسرے کے مقاصد کو بروئے کار لانے کا ذریعہ (INSTRUMENT) ہوں۔ میری ذاتی حیثیت کچھ نہیں۔ فرد کی ذاتی حیثیت اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب اس کی ذات کا احترام کیا جائے۔ جب اسے کسی دوسرے کے مقاصد کے بروئے کار لانے کا ذریعہ سمجھ لیا جائے، اس کے دل میں نفرت اور سرکشی کے جذبات ابھر آتے ہیں۔

(فٹ نوٹ صفحہ سابقہ) لے یہ جو ہم معاشرہ میں، ماں اور جوان اولاد میں کشمکش دیکھتے ہیں، آپکو معلوم ہے اسکی نفسیاتی وجہ کیا ہے؟ ماں اپنے بچے کی پرورش کرتی ہے تاکہ وہ اپنے پاؤں پر چلنے کے قابل ہو جائے، لیکن جب وہ بڑا ہو کر اپنے پاؤں پر چلنا چاہتا ہے تو ماں (یا والدین) اسے اسطرح چلنے نہیں دینا چاہتی۔ وہ اسے اپنی مرضی کے تابع دیکھنا چاہتی ہے۔ اس کی یہ روش اس کی سابقہ روش کے خلاف ہوتی ہے اس لئے بچے میں بھی محبت کا وہ جذبہ نہیں رہتا۔ آپ نے غور نہیں فرمایا کہ قرآن کریم نے جو یہ نہیں کہا کہ اولاد پر ماں باپ کی اطاعت لازم ہے تو اس میں کس قدر نفسیاتی حکمت مضمر ہے۔

اور یہاں سے ہمارا رخ اس گوشے کی طرف مڑ جاتا ہے جسے ہر معاشرہ میں مسلّمہ طور پر اوّلین حیثیت دی جاتی ہے۔ یعنی عدل۔ عدل کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک قانونی عدل اور دوسرا معاشرتی عدل۔

قانونی یا عدالتی عدل (SOCIAL JUSTICE) کے متعلق عام خیال (بلکہ متفق علیہ فیصلہ) یہ ہے کہ اگر کسی متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ ملک کے رائج الوقت قانون کے مطابق ہو جائے تو اسے مبنی بر عدل قرار دیا جائے گا۔ یہ ٹھیک ہے لیکن قرآن اس سے آگے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خود اس قانون کو بھی مطابق عدل ہونا چاہیئے۔ اگر وہ قانون ہی ظلم اور بے انصافی پر مبنی ہو تو اس کے مطابق فیصلے کو مبنی بر عدل کیسے کہا جائے گا۔ لہٰذا، وہ سب سے پہلے، قانون کی حد بندی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حدود اللہ کی حفاظت کرنے والوں کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ یَحْكُمُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ۔ (۷/۱۸۱) وہ الحق (وحی خداوندی) کے مطابق لوگوں کی راہ نمائی کرتے ہیں، اور اسی کے مطابق عدل کرتے ہیں۔ لہٰذا، قرآن کی رُو سے، فیصلہ وہی مبنی بر عدل سمجھا جائے گا جو اس قانون کی رُو سے کیا جائے جو الحق کے مطابق ہو۔ جہاں تک عدل کرنے کا تعلق ہے وہ اس سلسلہ میں کہتا ہے کہ لَا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۔ (۲/۱۲۳) کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی اس پر مؤثر نہ ہو۔ نہ کسی کی سفارش قبول کی جائے، نہ ہی جرم کا کوئی بدل لیا جائے۔ غرضیکہ اس باب میں کوئی بھی مجرم کا حمایتی نہ ہو۔ فیصلہ کسی خارجی اثر سے بالاتر ہو کر کیا جائے۔

قانونی عدل کا بنیادی مدار شہادت پر ہوتا ہے۔ اس باب میں قرآن کریم نے ایسی حد بندی کی ہے جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ اس نے کہا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ۔ (۴/۱۳۵) اے ایمان لانے والو! تم دنیا میں انصاف قائم کرنے کا موجب بنو۔ اگر تمہیں کسی متنازعہ فیہ معاملہ میں شہادت دینی ہو تو تم نہ مدعی کیطرف سے شہادت دو، نہ مدعا علیہ کیطرف سے۔ تم صرف خدا کیطرف سے گواہ بنکر جاؤ اور سچی سچی بات کہہ دو۔ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ۔ خواہ وہ بات خود تمہاری اپنی ذات کے خلاف کیوں نہ جائے۔ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ۔ یا تمہارے والدین یا دیگر اعزہ و اقارب کے خلاف۔ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا۔ خواہ متعلقہ فریق غریب ہو یا امیر، اس کا بھی کوئی اثر نہ ہو۔ فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا۔ تم تو خدا کی طرف سے گواہ بن کر گئے ہو۔ اسکا حق بہرحال فریقین کے مقابلہ میں فائق ہے۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا۔ یہ عدل کا اعلیٰ ہے۔ اس میں تمہارے جذبات کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیئے۔ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا۔ (۴/۱۳۵) گواہی دیتے وقت دو ٹوک بات کرو، ذو معنی نہ کرو۔ نہ ہی شہادت دینے میں اعراض برتو۔ یاد رکھو۔ تم لوگوں سے تو کچھ چھپا سکتے ہو۔ خدا سے کچھ نہیں چھپا سکتے۔

قرآن کریم کے متعین کردہ حدود کے مطابق، ملزم اور مجرم میں بنیادی فرق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ملزم کو اثبات جرم تک بے گناہ سمجھو۔ اس کے متعلق حسن ظن سے کام لو۔ (۴۹/۱۲) اور حسن ظن کا تقاضا ہے کہ ملزم کے متعلق تمہارا

ملزم اور مجرم میں فرق

اوّلین ردِ عمل (FIRST - REACTION) یہ ہو کہ هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ - (۲۴/۱۲)، وَ بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (۲۴/۱۶) یہ الزام جھوٹا معلوم ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! یہاں ایک لمحہ کے لئے رکئے اور ان چیخوں کو سنئے جو دورانِ تفتیش، ملزم پر تشدد سے فضا میں تھرتھری پیدا کر دیتی ہیں۔ جن ملزموں پر یہ تشدد برتا جاتا ہے۔ ان کی اکثریت بے گناہ ثابت ہو جاتی ہے، اور جن کے خلاف جرم ثابت بھی ہو جاتا ہے انہیں جو سزا ملتی ہے، وہ اکثر و بیشتر اس کرب و اذیت کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہوتی جس کا کندۂ قصاب انہیں دورانِ تفتیش بنایا گیا تھا۔ کئی ملزم اس اذیت کے مقابلہ میں موت کو ترجیح دیکر خودکشی کر لیتے ہیں۔ یہ طریقِ تفتیش انتہائی ظالمانہ ہے جو قرآن کی رو سے سنگین جرم قرار پاتا ہے۔ قرآنی نظام اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ جو نظام، ملزم کے متعلق اس قدر حسنِ ظن کی تاکید کرتا ہو، وہ اسکے خلاف ایسے وحشیانہ اقدام کی اجازت کیسے دے سکتا ہے!

جہاں تک مجرم کی سزا کا تعلق ہے خدا کی مقرر کردہ حد یہ ہے کہ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ (۴۲/۴۰) سزا مطابق جرم ہونی چاہیئے، جرم سے زیادہ نہیں۔ اور اگر مجرم میں احساس ندامت ابھرے اور اس کی اصلاح کی توقع ہو، تو اسے معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، کہ مجرم ارتکاب جرم کے بعد بھی انسان ہی رہتا ہے، اس لئے انسان ہونے کی حیثیت سے جو اس کا حق ہے۔ یعنی احترام آدمیت۔ وہ بدستور باقی رہتا ہے۔ نفرت، جرم سے ہوگی، مجرم سے نہیں۔ نفرت تو ایک طرف، قرآن کا حکم یہ ہے کہ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ - تم ایک دوسرے کا تمسخر نہ اڑاؤ۔ وَ لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ - عیب جوئی اور نکتہ چینی نہ کرو۔ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ۔ ایک دوسرے کے الٹے پلٹے نام نہ رکھو۔ وَ اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ۔ کبھی بدظنی سے کام نہ لو۔ وَ لَا تَجَسَّسُوْا دوسروں کے معاملات میں یونہی تجسس نہ کرو۔ وَ لَا يَغْتَبْ۔ (۴۹/۱۱-۱۲) کسی کی غیبت نہ کرو۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن افرادِ معاشرہ کے باہمی تعلقات کن بنیادوں پر استوار کرنا چاہتا ہے!

اور اس کے بعد عدل کا دوسرا گوشہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ یعنی معاشرتی عدل۔ معاشرتی عدل سے کیا مفہوم ہے، اس کے متعلق مغربی مفکرین نے بہت کچھ کہا ہے۔ مشیگن یونیورسٹی (امریکہ) کا فلسفہ کا پروفیسر

معاشرتی عدل

(WILLIAM K. FRANKENA) اس باب میں لکھتا ہے کہ معاشرتی عدل کے متعلق جو کچھ بھی کہا گیا ہے، اس کا ملخص یہ ہے کہ:

ایک سوسائٹی کو اس وقت مبنی بر عدل کہا جائے گا جب ہر فرد معاشرہ کو وہ کچھ مل جائے جو اس کا حق ہے۔ (WHAT IS DUE HIM)

اس کے بعد وہ خود ہی کہتا ہے کہ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسکا فیصلہ کس طرح کیا جائے کہ اس کا حق کیا ہے یعنی یہ فیصلہ کہ (WHAT IS DUE HIM) - اس سوال کا اطمینان بخش جواب کہیں سے نہیں مل سکتا۔ (SOCIAL JUSTICE. P. 3) قرآن اس کا جواب دو لفظوں میں دیتا ہے جب کہتا ہے، کہ احترام آدمیت، ہر فرد کا بنیادی حق ہے۔

ممتاز مغربی مفکر (ERNEST BARKER) اس باب میں لکھتا ہے کہ عدل کی بنیاد اصول اخلاق پر ہے اور تمام اخلاقی اصولوں کا سرچشمہ، فرد کی ذات کی قدر و قیمت ہے۔ اسی بنا پر وہ کہتا ہے کہ

> وہی معاشرہ عدل کا علمبردار کہلا سکتا ہے جس کا مقصود یہ ہو کہ تمام افراد معاشرہ کی ذات کی صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما ہو جائے۔

(PRINCIPLES OF SOCIAL AND POLITICAL THEORY - P. 123)

میں نے عزیزانِ من! شروع میں کہا تھا کہ خدا نے جو حدود مقرر کی ہیں ان کی فہرست طول طویل ہے اور میں ان سے سردست چند ایک آپ کے سامنے پیش کر سکوں گا۔ جو حدود میں نے پیش کی ہیں، انہی سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جس معاشرہ میں انسانی تقاضے ان حدود کے اندر رہتے ہوئے پورے کئے جائیں گے، وہ معاشرہ کسقدر جنت نشان ہو گا اور اس میں رہنے والے زندگی کی کن خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے بہرہ یاب۔ اس کے بعد ایک اہم سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ یہ حدود، قرآن کریم میں حروف و الفاظ کی شکل میں محفوظ ہیں۔ انہیں عملی پیکر بہرحال ایک نظام کی رُو سے عطا ہو گا۔ اور جب ہم نظام کہتے ہیں تو اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ نظام، بہرحال انسانوں ہی کے ہاتھوں متشکل ہو گا اور وہی اسے چلائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ وہ انسان کس قسم کے ہوں گے! قرآن ان انسانوں کو مومن کہہ کر پکارتا ہے۔ نظری اعتبار سے، مومن انہیں کہیں گے جو ان حدود کی صداقت پر یقین محکم رکھیں۔ لیکن عملاً یہ وہ لوگ ہوں گے جو ان حدود کی پوری پوری پابندی کریں۔ اسی لئے قرآن نے مومنین کی بنیادی خصوصیت اَلْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ - (۹/۱۱۲) - بتائی ہے۔ یعنی حدود اللہ کی محافظت کرنے والے۔ اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ - (۹/۱۱۲) ہر اس بات کو عملاً نافذ کرنے والے جسے قرآن صحیح اور جائز قرار دیتا ہے، اور ان سے روکنے والے، جنہیں وہ ناجائز ٹھہراتا ہے۔ قرآن کریم نے مومنین کی خصوصیات بھی بڑی وضاحت سے بیان کی ہیں۔ میں اسوقت ان میں سے بھی چند ایک آپ کے سامنے پیش کر سکوں گا۔

آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے زندگی کے تین بنیادی (جبلّی) تقاضے بتائے تھے۔ یعنی تحفظ خویش، تغلب خویش اور جذبہ افزائش نسل۔ اس وقت تک ہم نے پہلے دو تقاضوں کے متعلق گفتگو کی ہے۔ اب ہم تیسرے تقاضا کیطرف

جنسی تقاضا

آتے ہیں۔ اسے عام طور پر جنسی تقاضا کہہ کر پکارا جاتا ہے، اور اسے بھی زندگی کی تعمیر و تخریب میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم، حفاظت عصمت کو مومنین کی اہم خصوصیت قرار دیتا ہے۔ (۲۳/۵ وغیرہ) یہاں ہم پھر ایک بار فطرت کے کنٹرول کیطرف لوٹتے ہیں۔ جنسی تقاضا حیوان کے اندر موجود ہوتا ہے لیکن حیوانات کی صورت میں فطرت نے اس پر ایسا کنٹرول عائد کر رکھا ہے کہ وہ اس تقاضا کو صرف افزائش نسل کے لئے پورا کرتے ہیں۔ حیوانات کے نر و مادہ، سارا سال، مخلوط ماحول میں آزادانہ پھرتے ہیں لیکن ان میں کبھی جنسی اختلاط کا جذبہ نہیں ابھرتا۔ جذبہ اس وقت ابھرتا ہے۔ جب افزائش نسل کے پیدائشی موسم (MATING SEASON) آتا ہے۔ اس وقت وہ جنسی اختلاط کرتے ہیں اور اس کے بعد پھر جب

سابق، اِدھر سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ انسان پر فطرت نے اپنا کنٹرول نہیں رکھا تو اس نے اس تقاضا کا مقصد افزائش نسل قرار دینے کے بجائے، اسے حصولِ لذت کا ذریعہ بنا لیا اور اس کے بعد اسطرح کُھل کھیلا کہ توبہ بھلی! یوں تو جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، زندگی کے ہر تقاضا میں حدود شکنی، فساد اور تخریب کا موجب ہوتی ہے، لیکن جس قدر تباہی جنسی بدنہادی (SEX - PERVERSION) مچاتی ہے، زندگی کے کسی دوسرے گوشے میں اسکی مثال نہیں ملتی۔ اس بدنہادی کو زنا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے، قوموں کی اجتماعی زندگی کسقدر تباہ ہوتی ہے، اسے میں آگے چل کر بتاؤں گا۔ انفرادی طور پر قرآن کہتا ہے مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا۔ (۲۵/۶۸) اس سے زندگی کی صلاحیت بخش توانائیاں مضمحل ہو کر رہ جاتی ہیں۔

ضبطِ نفس

واضح رہے کہ جنسی تقاضا کی صورت، طبیعی ضروریات، مثلاً بھوک، پیاس، کی سی نہیں۔ یہ تقاضے جسمانی ضرورت کے ماتحت از خود ابھرتے ہیں اور اگر انہیں پورا نہ کیا جائے تو انسان بیمار ہو جاتا ہے اور پھر آخر الامر اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ آپ کسی کام میں کسقدر منہمک، اور کسی فکر میں کسقدر غلطاں کیوں نہ ہوں، اگر آپ کے بدن کو پانی کی ضرورت ہے تو پیاس کا تقاضا ابھرے گا۔ ابھرتا چلا جائیگا۔ اور جب تک آپ اسے پورا نہیں کرینگے، وہ آپ کو چین نہیں لینے دے گا۔ اگر اس کی تسکین نہیں کریں گے تو آپ بیمار ہو جائیں گے اور اگر چند دنوں تک یہی حالت رہے تو آپ پر موت وارد ہو جائے گی۔ لیکن جنسی تقاضا از خود کبھی نہیں ابھرتا، خواہ اس پر ساری عمر کیوں نہ گذر جائے۔ یہ اس وقت ابھرے گا جب آپ اس کا خیال کریں گے: خواہ یہ خیال آپ کے داخلی تصورات کا نتیجہ ہو یا خارجی محرکات کا۔ پھر، اگر آپ برسوں تک بھی اس کا خیال نہیں کریں گے تو موت تو ایک طرف، آپ پر کوئی عارضہ تک بھی لاحق نہیں ہو گا۔ اس کے برعکس، پاکباز انسانوں کا عملی تجربہ یہ ہے کہ اس سے انسانی توانائیوں اور صلاحیتوں میں نہایت خوشگوار اضافہ ہوتا جائے گا۔ طبیعی اور جنسی تقاضوں میں یہی وہ فرق ہے جس کی وجہ سے قرآن نے، بھوک پیاس کی اضطراری حالت میں، حرام اشیاء کھا لینے کی اجازت دی ہے لیکن جنسی تقاضا کے لئے ایسی اجازت نہیں دی۔ اس کے برعکس، اس نے کہا ہے کہ اگر کسی کو اس تقاضا کی تسکین کی جائز صورت میسر نہ آئے، تو اسے چاہیئے کہ ضبطِ خویش (SELF - CONTROL) سے کام لے۔ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا۔ (۲۴/۳۳) جو لوگ نکاح کا امکان نہ پائیں، انہیں چاہیئے کہ ضبطِ نفس سے کام لیں۔

فواحش

میں نے پہلے کہا ہے کہ جنسی جذبہ از خود بیدار نہیں ہوتا۔ اسے خارجی محرکات پیدا کرتے ہیں۔ خارجی محرکات انسان کی تخیلاتی یا تصوراتی دنیا میں ہیجان پیدا کرتے ہیں، اور یہ ہیجان جنسی جذبہ کو ابھارنے کا موجب بن جاتا ہے، خواہ یہ عمل شعوری طور پر ہو یا غیر شعوری طور پر۔ قرآن کریم ان محرکات کو فواحش کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے، اور انہیں حرام قرار دیتا ہے۔ سورہ اعراف میں ہے قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ۔ (۷/۳۳) ان سے کہہ دو کہ خدا نے فواحش کو حرام قرار دیا ہے، خواہ وہ خارجی دنیا میں ہوں یا انسان کی داخلی دنیا میں۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن نے خارجی اور داخلی دنیا، دونوں کے محرکات کو حرام قرار دیکر اس حد کو کس قدر واضح اور جامع بنا دیا ہے۔ فواحش کو حرام قرار دیا اور ساتھ

ہی کہہ دیا کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ - (۲۴/۱۹) اے رسول! اعلان کر دو کہ جو لوگ اہل ایمان کے معاشرہ میں فواحش کو عام کریں گے ان کے مقدر میں اس دنیا میں بھی الم انگیز تباہی ہوگی اور مستقبل کی زندگی میں بھی کرب آمیز عذاب۔ ہمارے زمانے میں یہ فواحش اس قدر عام ہو رہے ہیں کہ ان کا احصاء مشکل ہے۔ ہماری شاعری، عام لٹریچر، موسیقی، ڈرامے، افسانے، ناول، ریڈیو، ٹیلی ویژن، سینما، عریانی سب انہی فواحش کے مظاہر ہیں۔ ان مظاہر سے جنسی جذبات میں جو ہیجان برپا ہوتا ہے، جن لوگوں کو اس کی تسکین کا عملی سامان میسر آ جاتا ہے وہ اس میں از سرتا پا غرق ہو جاتے ہیں، جو ذی مقدور نہیں ہوتے، وہ ذہنی عیاشی ہی سے لذت یاب ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی کیفیت (غالب سے معذرت کے ساتھ) یہ ہوتی ہے کہ

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن۔ بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

جنسی بدنہادی کا اجتماعی نقصان کیا ہوتا ہے اس کے متعلق میں، اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتا بلکہ اس ملک کے محقق کا نتیجۂ فکر پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جو اس حد درد فراموشی میں پست ترین درجے پر پہنچ چکا ہے، یعنی یورپ کی مہذب دنیا۔ کیمبرج کے پروفیسر ڈاکٹر (J. D. UNWIN) نے، دنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے اسی قبائل کا مشاہدہ اور مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا کہ جنسی ضوابط کا قوموں کی تمدنی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اپنی تحقیقات کے ان نتائج کو اس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب (SEX & CULTURE) میں پیش کیا ہے۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ

> "کوئی گروہ کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتا ہو، اس کی تمدنی سطح کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ اس نے جنسی تعلقات کیلئے کس قسم کے ضوابط مرتب کر رکھے تھے"۔ (صفحہ ۳۴۰)

آگے چل کر وہ لکھتا ہے

> جو قوم اپنے مردوں اور عورتوں کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ جنسی خواہشات کی تسکین جس طرح جی چاہے کر لیں، اُن میں فکر و عمل کی قوتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ رومیوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ حیوانوں کی طرح بلا قیود جنسی جذبات کی تسکین کر لیا کرتے تھے، نتیجہ یہ کہ ان کے پاس کسی اور کام کیلئے توانائی باقی نہ رہی۔ (صفحہ ۳۹۸)

وہ اپنی کتاب کا اختتام ان الفاظ پر کرتا ہے کہ

> اگر کوئی معاشرہ چاہتا ہے کہ اس کی تخلیقی توانائیاں مدت مدید، بلکہ ابدالآباد تک قائم اور آگے بڑھتی رہیں، تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ پہلے اپنی تخلیق نو کرے۔ یعنی پہلے اپنے مردوں اور عورتوں کو قانوناً مساوی حیثیت دے اور پھر اپنے معاشی اور معاشرتی نظام میں اس قسم کی تبدیلیاں کرے، جن سے معاشرہ میں جنسی اختلاط کے مواقع کم از کم حد تک محدود رہیں۔ اس طرح اس معاشرہ کا رخ ثقافتی اور تمدنی ارتقاء کی طرف مڑ جائے گا۔ اس کی روایات شاندار ماضی اور درخشندہ مستقبل کی حامل ہوں گی۔

> وہ تہذیب و تمدن کے اس بلند مقام تک پہنچ جائے گا۔ جس تک آج تک کوئی معاشرہ نہیں پہنچ سکا اور انسانی توانائیاں ان روایات کو ایسے انداز سے صیقل کرتی جائیں گی، جو اُس وقت ہمارے حیطۂ ادراک میں نہیں آسکتا۔ (صفحہ ۲۳۲)

میں اس مقام پر زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ جو احباب اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ میری کتاب "سلیم کے نام خطوط" کی تیسری جلد میں میرا وہ خط ملاحظہ فرمالیں، جس کا عنوان ہے۔ "تمدن پر جنسیات کا اثر"۔

شراب

جنسی جذبہ کے ہیجان میں شراب کا بڑا دخل ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے یہ کہہ کر اسکی ممانعت کردی کہ یہ بمنزلہ شیطان ہے، یعنی جذبات کو سرکش اور بیباک بنادینے والی۔ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ شراب نوشی محض ایک بری عادت ہے، لیکن دورِ حاضر کی تحقیقات اس نتیجے پر پہنچی ہیں کہ یہ بری عادت نہیں بلکہ ذہنی اور جذباتی عدم توازن کی علامت ہے۔ (ERICH FROMM) نے اپنی کتاب (THE SANE SOCIETY) میں مختلف ممالک کے اعداد و شمار سے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ جن ممالک میں سامانِ تعیش کی فراوانی ہے، اُن میں شراب نوشی کی کثرت ہے اور اسی نسبت سے وہاں خودکشی کی واردات بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ (صفحات ۱۸-۱۴)۔ ان حقائق سے ظاہر ہے کہ جن ممالک میں فواحش کی اشاعت زیادہ ہو اور شراب نوشی کثرت سے پھیل جائے، وہاں زنا عام ہو جاتا ہے اور اس کا فطری نتیجہ فرد اور معاشرے کے توازن کا بری طرح بگڑ جانا ہے۔ یہی بگڑا ہوا توازن قوموں کو لے ڈوبتا ہے۔

امانات کی تفویض

ہمارے آئین میں کہا گیا ہے کہ مملکت کے اختیارات مقدس امانت ہیں، جو اُن حدود کے اندر استعمال کئے جاسکتے ہیں جنہیں خدا نے متعین کیا ہے۔ قرآن کریم نے خود ان حدود کو امانت کہہ کر پکارا ہے اور تاکید کی ہے کہ اختیارات کی یہ امانت اُن لوگوں کے سپرد کرو جو اس کے اہل ہوں۔ (۴/۵۸) اور جماعت مومنین کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ اپنی امانات اور اپنے وعدوں کی ہمیشہ نگہداشت کرتے ہیں (۲۳/۸)۔ یہاں اس نے امانات کی حفاظت کے ساتھ پابندیٔ عہد کو بھی برابر کی اہمیت دی ہے، اور یہ بڑا فکر انگیز اور غور طلب نکتہ ہے۔ ہم وعدہ ایفائی کو چنداں اہمیت نہیں دیتے لیکن قرآن کریم کی رو سے کسی معاشرہ یا نظام کے استحکام کا دار و مدار برسر اقتدار طبقہ اور عوام، اور پھر عوام کے باہمی اعتماد پر ہوتا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ باہمی اعتماد پیدا ہی وعدوں کی پابندی سے ہوتا ہے۔ مغربی مفکر نطشے نے، جسے ہمارے حکیم الامت نے "مجذوب فرنگی" کہہ کر پکارا ہے۔ اس عمیق نکتے کو ایسے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے جس سے انسانی بصیرت رقص کرنے لگ جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے

"انسان ہی وہ حیوان ہے جو وعدہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے"۔ غور کیجئے کہ یہ دیوانہ چار لفظوں میں کیسی پتہ کی بات کہہ گیا ہے۔ آپ سے کوئی شخص کچھ قرض لیتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ وہ اسے چھ ماہ میں لوٹا دے گا۔ اس

کے بعد وہ کہیں گم ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد دو آپ کو اتفاقیہ مل جاتا ہے اور آپ اس سے قرضہ کی واپسی کا تقاضا کرتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ آپ سے بھول ہو گئی ہے۔ میں تو وہ نہیں جسے آپ نے قرضہ دیا تھا اور اس نے واپسی کا وعدہ کیا تھا۔ اگر تحقیق کے بعد وہ شخص وہی ثابت ہو جاتا ہے، تو وہ قرضہ اس کے ذمے واجب الادا قرار پا جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ وہ شخص وہی نہیں تو پھر اس پر کچھ واجب نہیں آتا۔ دنیا کا کوئی قانون اس کے خلاف ڈگری نہیں دے سکتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایفائے عہد کی ذمہ داری اسی صورت میں عائد ہو سکتی ہے جب وہ فرد وہی ہو۔

وعدہ ایفائی

علمائے علم الحیات کی تحقیق یہ ہے کہ انسانی جسم میں ہر آن کروڑوں خلیات (CELLS) تلف ہوتے رہتے ہیں اور کروڑوں نئے خلیات اُن کی جگہ لے لیتے ہیں۔ یہ سلسلۂ زندگی بھر جاری رہتا ہے، اور تحقیق یہ ہے کہ ہر انسان کا جسم تین یا زیادہ سے زیادہ سات سال میں یکسر بدل کر نیا ہو جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر انسان عبارت ہے اپنے طبیعی جسم ہی سے تو تین، یا سات سال کے بعد وہ انسان باقی ہی نہیں رہتا۔ اور جب وہ باقی ہی نہیں رہتا تو تین یا سات سال پہلے کے وعدہ کی ذمہ داری اس پر عائد ہی نہیں ہو سکتی۔

لیکن علمائے نفسیات کی تحقیق یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک ایسی شے بھی ہے جو جسم کے تغیرات سے قطعاً متاثر نہیں ہوتی، وہ ہمیشہ ویسی ہی رہتی ہے۔ اور یہی وہ شے ہے جو وعدہ کرتی ہے اور جس کے پورا کرنے کی ذمہ داری اس پر ہمیشہ واجب رہتی ہے۔ اسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ اور ذات صرف انسان کو حاصل ہے۔ حیوان کو نہیں۔

جو شخص وعدہ کر کے اس کا ایفا نہیں کرتا، یا کوئی اور ذمہ داری اپنے اوپر لے کر اسے پورا نہیں کرتا ظاہر ہے کہ وہ انسان نہیں، انسان کی شکل میں حیوان ہوتا ہے۔ بلکہ اُن سے بھی بدتر، کہ حیوان وعدہ کر ہی نہیں سکتا اور یہ وعدہ کر کے اس سے پھر جاتا ہے۔ ایفائے عہد کی یہی وہ اہمیت ہے جسے قرآن نے مومنین کی ایک بنیادی خصوصیت قرار دیا ہے یہ وہ حد ہے جس کی خلاف ورزی سے باہمی اعتماد اٹھ جاتا ہے، اور معاشرہ کی بنیادوں میں تزلزل واقع ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ وعدہ فراموش ارباب حل وعقد سے کہتا ہے کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ۔ (۶۱/۲) ۔ جو کچھ تم لوگوں سے زبانی کہتے ہو اسے عملاً کرتے کیوں نہیں۔ یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا ۔ (۳/۱۸۸) تم چاہتے ہو کہ لوگ ان باتوں کی بنا پر تمہاری شان میں قصیدے پڑھیں جنہیں تم کرکے نہیں دکھاتے۔ ایفائے عہد کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ خدا خود اپنے متعلق کہتا ہے کہ (اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ۔ (۳/۹) خدا کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا اور اس حقیقت کو اور وضاحت سے سمجھانے کے لئے یہاں تک کہہ دیتا ہے کہ کَانَ عَلٰی رَبِّکَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا ۔ (۲۵/۱۶) ۔ ایفائے عہد کے متعلق، اور تو اور، خود خدا سے بھی پوچھا جا سکتا ہے۔ اس سے ایفائے عہد کی اہمیت کا اندازہ لگائیے۔

میں نے کہا ہے کہ ذمہ داری کی محل انسانی ذات ہوتی ہے۔ اور یہاں سے ایک بنیادی سوال کا جواب ہمارے

سامنے آجاتا ہے۔ اکثر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی چیز ہے جس کی بناء پر انسان، صاحبِ اختیار و ارادہ ہونے کے باوجود ان پابندیوں کو قبول کر لیتا اور پھر انہیں بطیبِ خاطر نباہتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ چیز انسان کا اپنی ذات پر ایمان ہے۔ یہ نکتہ تھوڑی سی وضاحت چاہتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ انسانی اختیار و ارادہ، اس کی ذات کی خصوصیت ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ انسان جو بھی فیصلہ کرتا ہے اس کی ذمہ دار اس کی ذات ہوتی ہے۔ اور جب اس فیصلہ کی ذمہ دار اس کی ذات ہوتی ہے تو اس کے نتائج بھی اسے ہی بھگتنے پڑتے ہیں۔ نتائج بھگتنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اگر انسان، حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے اپنے اختیارات کا استعمال کرتا ہے تو اس سے اس کی ذات پر

قانونِ مکافاتِ عمل

تعمیری اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یعنی وہ اس سے نشو و نما پاتی ہے۔ اور اگر وہ ان حدود سے تجاوز یا سرکشی برتتا ہے تو اس کی ذات پر اس کے تخریبی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۔ (۲/۲۸۶)۔ اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں اور یہ وہ بنیاد ہے جس پر دین کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس کے لئے نہ کسی (DETECTIVE) کی ضرورت ہوتی ہے نہ پولیس مین کی۔ نہ کسی عدالت کی احتیاج ہوتی ہے نہ جیل خانے کی۔ انسان کا ہر عمل، وہ جہاں اور جس حالت میں بھی سرزد ہو۔ اپنا نتیجہ از خود اس کی ذات کو متاثر کرتا رہتا ہے اور چونکہ یہ سب کچھ خدا کے متعین کردہ قانونِ مکافات کی رو سے ہوتا ہے اس لئے اسے ان الفاظ میں سمجھایا جاتا ہے کہ انسان اپنے ہر عمل کے لئے خدا کے حضور جوابدہ ہوتا ہے۔ اور چونکہ انسانی ذات، اس کی طبعی موت کیساتھ ختم نہیں ہو جاتی، (زندہ رہتی اور آگے چلتی ہے جسے اخروی زندگی کہتے ہیں) اس لئے اس جوابدہی کا سلسلہ مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ قرآن کریم نے اس محاسبہ، مواخذہ اور جوابدہی کے سلسلہ کو مختلف انداز سے بڑی شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ وہ سب سے پہلے انسان کی اس غلط فہمی اور خود فریبی کو دور کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ ارتکاب جرم کرتا ہے۔ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗۤ اَحَدٌ ۔ (۹۰/۷) یعنی وہ سمجھتا ہے کہ مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ جب کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا تو خدا اسے اس وقت بھی دیکھ رہا ہوتا ہے۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۲/۲۶۵) یہی نہیں کہ خدا اُسوقت دیکھتا ہے جب جرم محسوس شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ۔ (۴۰/۱۹) وہ دل میں چھپائے ہوئے رازوں اور نگاہ کی خیانتوں سے بھی واقف ہوتا ہے اور اس کا ہر ظاہر و باطن عمل ریکارڈ کر لیا جاتا ہے۔ یہ ریکارڈ کہیں خارج میں نہیں رکھا جاتا، وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۔ (۱۷/۱۳) ہر انسان کا اعمال نامہ اس کی

اعمالنامہ

گردن میں لٹکا ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے وہ لپٹا ہوا ہوتا ہے اور ظہورِ نتائج کے وقت اسے کھول دیا جاتا ہے۔ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۔ اور انسان سے کہا جاتا ہے کہ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۔ تو اپنا اعمالنامہ خود آپ پڑھ۔ كَفٰى

بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ۔ (۱۷/۱۴) اور اپنا حساب بھی آپ ہی کر لے۔ اس کے لئے تو آپ ہی کافی ہے۔ یہ ہے وہ اعمالنامہ جسے کھلا دیکھ کر انسان چیخ اٹھے گا (فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ) وَيَقُولُونَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَّلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصٰهَا۔ اور کانپتے، تھرتھراتے ہوئے کہے گا کہ یہ کس قسم کا ریکارڈ ہے جس میں میرا ہر چھوٹا بڑا عمل درج ہے۔ انہی اعمال کا نتیجہ اس کے لئے عذاب بن جائے گا۔ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا ۔ (۱۸/۴۹) یاد رکھو! خدا کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں کرتا۔ انسان کا اپنا کیا اسکے سامنے آجاتا ہے۔

یہ ہے عزیزانِ من! اس تمام داستان کا نقطۂ آغاز اور حرفِ آخر۔ یعنی انسان کا اپنی ذات پر ایمان۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو قرآن کریم، انسان سے بات شروع کر کے، خدا تک لے جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص، انسانی ذات اور اس کے مالہٗ اور ماعلیہ پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کا خدا پر ایمان کچھ معنی نہیں رکھتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے علامہ اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

شاخِ نہالِ سدرۂ خار و خس چمن مشو ۔ منکرِ او اگر شدی منکرِ خویشتن مشو

مغرب کے مادی تصورِ حیات نے انسانی ذات سے انکار کر کے، زندگی کو طبیعی حدود تک محدود کر دیا جس سے انسانی اختیارات پر کوئی کنٹرول نہ رہا۔ اسکا نتیجہ یہ کہ دنیا انسانوں کی بستی نہ رہی، درندوں کا بھٹ بن گئی۔ حکومت کا سیکولر نظام بھی اسی تصورِ حیات کا نتیجہ ہے جس میں اربابِ اقتدار کو لامحدود، مطلق اختیارات کا مالک سمجھا جاتا ہے، خواہ وہ شخصی حکومت ہو یا جمہوری۔

سوشلزم اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتی ہے۔ مغربی جمہوریت، حکومت کے حیطۂ اقتدار کو حدود سے مقید نہیں سمجھتی لیکن اتنا تسلیم کرتی ہے کہ پرائیویٹ زندگی میں اخلاقیات کی پابندی کی جا سکتی ہے۔ سوشلزم ان حدود کا سرے سے انکار ہی کر دیتی ہے۔ لینن کے یہ الفاظ کسے یاد نہیں کہ:

> ہم اُن تمام ضابطہ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی مافوق البشر سرچشمہ یا غیر طبقاتی تصور کے پیدا کردہ ہوں۔ ہم علانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصور فریب ہے، دھوکا ہے۔ یہ تصور جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے مفاد کے تحفظ کی خاطر محنت کشوں اور کاشتکاروں کے دلوں کو تاریکی اور دھند میں رکھنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ضابطۂ اخلاق، محنت کشوں کی طبقاتی جنگ کے تابع ہے۔ یہی ہمارے ضابطۂ اخلاق کا سرچشمہ ہے۔ سرمایہ داروں کا دعویٰ ہے کہ ان کا ضابطہ اخلاق احکامِ خداوندی پر مبنی ہے۔ (ہم اس تصور کو ٹھکراتے ہیں) ہم خدا وغیرہ کچھ نہیں جانتے۔ ہم اسے مانتے ہی نہیں۔ اخلاق، انسانی معاشرہ ہی کا نام ہے۔ اس سے ماوراء جو کچھ ہے، فریب ہے۔ ہم کسی ابدی صداقت کے قائل نہیں۔ اس قسم کے اخلاق کے متعلق جس قدر افسانے وضع کئے گئے ہیں، ہم ان سب کا پردہ چاک کر کے رکھ دیں گے۔

(MARX-ENGELS MARXISM. P. 461-65)

غور سے دیکھئے تو سوشلزم انسانیت کی دُہری تذلیل کرتی ہے۔ ایک تو اس کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کے لئے مسئلہ صرف روٹی کا ہے۔ اس سے وہ انسان کو خالص حیوانی سطح پر لے آتی ہے۔ اور روٹی کے لئے اس کا نظریہ یہ ہے کہ اس کے حصول کے لئے جو طریقہ بھی ضروری خیال کیا جائے، اُسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس میں قطعاً کوئی ہرج نہیں۔ یعنی وہی میکیاولی نظریہ کہ

MEANS ARE JUSTIFIED BY THE ENDS ACHIEVED.

جو ذریعہ بھی مقصد کے حصول میں ممد و معاون ہو، وہ جائز اور مستحسن ہے۔ اس نظریہ کی رو سے روٹی حاصل کرنے کے لئے ہر طریق جائز قرار پا جائے گا۔ حتیٰ کہ عصمت فروشی تک بھی۔

حدود اللہ کا نظریہ اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ وہ مقاصد بھی ان حدود کے تابع متعین کرتا ہے اور ان کے حصول کے ذرائع بھی انہی کے اندر رہتے ہوئے جائز قرار دیتا ہے۔ جو حکومت اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر دے، وہ اسے حکومت ہی تسلیم نہیں کرتا اور کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ اس کی اطاعت مت کرو۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔ (۱۸/۲۸)

جو ہمارے قوانین کی طرف سے غافل ہو جائے اور اپنے جذبات ہی کے پیچھے لگ جائے۔ اور یوں حدود فراموش ہو جائے، اس کی اطاعت مت کرو۔

اطاعت اسی نظام کی ہے جو اپنے اختیارات کو خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کرے۔ مغرب کے سیکولر نظام جمہوریت نے کہا کہ قوم کے نمائندے، مملکت کے لئے ایک آئین مرتب کریں اور جو حکومت اس آئین کے مطابق کاروبار مملکت سرانجام دے، اس کی اطاعت، افراد مملکت پر قانوناً واجب ہو۔ اس لئے کہ وہ حکومت آئینی (CONSTITUTIONAL) قرار پاتی ہے اور اسکے وضع کردہ قوانین جائز (VALID) لیکن قرآن کریم نے کہا کہ سوال یہ نہیں کہ آئین کس کا مرتب کردہ ہے اور قوانین کس کے وضع کردہ۔ جو آئین، مستقل اقدار خداوندی کی نگہداشت نہیں کرتا، وہ جائز آئین ہی نہیں۔ اور جب وہ آئین ہی جائز نہیں تو اس کے مطابق قائم شدہ حکومت کسطرح جائز اور حق بجانب قرار پا سکتی ہے۔ لہٰذا اس قسم کی حکومت کی اطاعت بھی جائز نہیں۔ اطاعت اس حکومت کی جائز بلکہ واجب ہے، جو اقدار خداوندی کو عملاً نافذ کرے۔ مغرب کے خدا فراموش معاشرہ نے اس تصور کو رجعت پسندی اور قدامت پرستی سے تعبیر کیا اور کہا کہ اس قسم کی شرائط، حدود اور قیود، مملکت کے اقتدار مطلق کی نفی کرتی ہیں۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے ناکام تجربہ کے بعد، خود وہاں کے مفکرین نے بھی محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ جو کچھ قرآن کریم نے کہا تھا وہی صحیح راہِ عمل ہے۔ چنانچہ (BARKER) کہتا ہے کہ

مملکت کے ساتھ میری وفاشعاری (LOYALTY) اُن اقدار کے تابع ہے جن کے تحفظ کے لئے مملکت کا وجود عمل میں آیا ہے۔ اگر مملکت ان اقدار کی وفاشعار نہیں رہتی تو انہی اقدار کے تقاضا کی رو سے میں مجبور ہو جاتا ہوں کہ اپنی وفاداری کو عدم وفاداری میں بدل دوں اور اسطرح ایک خوشگوار فرماں پذیری کے بجائے، بادلِ ناخواستہ مزاحمت کی روش اختیار کر لوں۔ (صت ۱۹۵) حقیقت یہ ہے کہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ مملکت ایسے معاہدہ کا بنیادی حق رکھتی ہے جس کی رو سے اس کی اطاعت ہم پر بہر حال واجب ہو۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مملکت، عدل کی مظہر اور اسے عمل میں لانے کا ذریعہ ہے۔ ہم پہ مملکت کے اربابِ اختیارات کے احکامات کی پابندی اس لئے لازم ہوتی ہے کہ مملکت عدل قائم کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر مملکت ایسی نہیں رہتی تو اس کے ساتھ ہماری وفاشعاری اور اطاعت ختم ہو جاتی ہے۔ (صت ۱۹۳)

آگے چل کر وہ لکھتا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اطاعت کا وجوب مشروط ہوتا ہے، مطلق نہیں ہوتا۔ یہ اطاعت ہر حالت میں واجب نہیں ہوتی۔ یہ اس وقت تک واجب رہتی ہے جب تک یہ حق کے کسی بلند تقاضے کے ساتھ ٹکراتے نہیں۔ (صت ۲۴۲)

بارکر نے کہا ہے کہ اگر اربابِ اختیار حق کی نگہداشت نہ کریں تو مجھ پہ واجب ہو جاتا ہے کہ میں ان کی مزاحمت کروں۔ لیکن جو مملکت، قرآنی حدود کی رو سے قائم ہو، اس کے اربابِ اختیار ایسی صورت پیدا ہی نہیں ہونے دیتے جس میں افرادِ مملکت اس قسم کی مزاحمت کے لئے مجبور ہو جائیں۔ وہ زمامِ اقتدار ہاتھ میں لینے کے ساتھ ہی اعلان کر دیتے ہیں کہ :

تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسُول کی اطاعت کروں۔ لیکن اگر مجھ سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جس سے اللہ اور اس کے رسُول کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔

یہ وہ الفاظ تھے جو رسول اللہ کے بعد، مسلمانوں کی پہلی حکومت کے سربراہ، صدیق اکبرؓ نے، اپنے پہلے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمائے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ خود اسلامی حکومت کے اربابِ حل و عقد کا کردار کتنا بلند ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اس کی صراحت کر دی کہ لَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ (۲۶/۱۵۱) حدود اللہ سے تجاوز کرنے والوں کی اطاعت مت کرو۔ فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ (۶۸/۸) جو لوگ زبانی قوانینِ خداوندی کا اقرار کریں لیکن عملاً انہیں جھٹلائیں، ان کی اطاعت مت کرو۔ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ (۶۸/۱۰) ایسے شخص کی اطاعت مت کرو جو دنی الطبع ہو اور یونہی قسمیں کھا کھا کر لوگوں کا اعتماد حاصل کرنا چاہے۔ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيْمٍ (۶۸/۱۱) مختلف حربوں اور دسیسہ انگیزیوں سے معاشرہ میں تفرقہ پیدا کرے۔ ہر وقت لگائی بجھائی میں مصروف رہے اور اپنی باتوں میں جھوٹ سچ ملا کر فساد برپا کرنے

کی کوششوں میں مشغول ۔ مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۔ (۶۸/۱۲) خود بھی کوئی بھلا کام نہ کرے اور دوسروں کو بھی بھلائی کے کاموں سے روکتا رہے ۔ صحیح قوانین سے سرکشی برتنے میں سب سے آگے اور منفعت بخش امور میں سب سے پیچھے ۔ عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۔ (۶۸/۱۳) شقی القلب، سخت گیر، بے رحم، جھگڑالو ۔ اس قسم کے لوگ محض اس لئے قوت حاصل کر لیتے ہیں کہ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِيْنَ ۔ (۶۸/۱۴) کہ وہ مالدار ہوتے ہیں اور ان کا قبیلہ، جتھہ، یا پارٹی کثیر التعداد ہوتی ہے ۔ ایسے لوگوں کی اطاعت مت کرو ۔ (۹۶/۱۱-۱۰) ۔ اس نے کہا ہے کہ اقوام سابقہ اس لئے تباہ ہو گئیں کہ وَ اتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (۱۱/۵۹) انہوں نے مستبد اور جابر، حدود فراموش، حکمرانوں کی اطاعت شروع کر دی ۔

باقی رہا مغربی انداز جمہوریت کا یہ اصول کہ جو قانون اکثریت کی رائے سے منظور ہو وہ بہر حال مبنی برحق سمجھا جائیگا فلہٰذا واجب الاطاعت، تو قرآن کریم اس اصول کو بھی باطل قرار دیتا ہے اور واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۔ (۶/۱۱۶) ۔ اگر تم کسی بات کی اطاعت محض اس لئے اختیار کر لو کہ اکثریت اس کے حق میں ہے، تو یاد رکھو، یہ روش تمہیں خدا کے راستے سے بہکا دیگی ۔ اکثریت محض اکثریت ہونے کی بنا پر، حق پر نہیں ہو سکتی ۔ لوگ محض ظن و قیاس کے پیچھے لگ جاتے ہیں ۔ اور ظن و قیاس، حق و باطل کا معیار قرار نہیں پا سکتے ۔ حق و باطل کا معیار، خدا کی کتاب ہے اس لئے اطاعت اس حکومت کی لازم ہو گی جو کتاب اللہ کے مطابق ہو ۔

اسی قسم کے قانون کا تصور تھا جس کے پیش نظر، آج سے بہت پہلے، روما کے مشہور مقنن، (CICERO) نے کہا تھا، اور جسے امریکہ کے کانسٹی ٹیوشن کے ممتاز ماہر، ایڈورڈ کارون نے اپنی کتاب (THE HIGHER LAW) میں دہرایا ہے کہ

> حقیقی قانون، مبنی برحکمت اور فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہے ۔ یہ فضا میں ہر جگہ پھیلا ہوا غیر متبدل اور ابدی ہوتا ہے ۔ یہ قانون معروف کا حکم دیتا ہے، منکر سے روکتا ہے ۔ یہ مملکت کا مقدس فریضہ ہے کہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کرے جو اس قانون کے خلاف ہو ۔ اسے اسکا حق حاصل نہیں کہ وہ اس میں کسی قسم کی ترمیم کرے ۔ نہ ہی وہ اسے منسوخ کر سکتی ہے ۔ نہ ہماری پارلیمان اور نہ ہی سینٹ کو اسکا اختیار ہے کہ وہ لوگوں کو اس قانون کی اطاعت سے آزاد کر دے ۔
> ..... نہ ہی اس قانون کی یہ کیفیت ہے کہ روما کیلئے الگ قانون ہو اور ایتھنز کے لئے الگ ۔ ایک قانون آج ہو اور دوسرا کل ۔ یہ ایک ازلی، غیر متبدل قانون ہے جو ابدی طور پر تمام اقوام کو اپنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے ۔ (صفحہ ۱)

قرآن کریم نے دنیا کو اس قسم کا ضابطہ قوانین عطا کیا، جسے حدود اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ وہی مملکت اسلامی کہلا سکے گی جو حدود اللہ کی حفاظت کے لئے قائم ہو اور وہی

حکومت برسرِ حق جو ان حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے اختیارات کا استعمال کرے۔ یہی وہ حکومت ہے جس کی اطاعت دینی فریضہ قرار پاتی ہے۔ یہ حکومت، ان لوگوں کے ہاتھوں قائم ہوتی ہے جو حدود اللہ کی نگہداشت کے لئے حکومت قائم کرتے ہیں اور اپنے اختیارات کو ایک مقدس امانت سمجھ کر، انہیں ان حدود کے اندر استعمال کرتے ہیں۔ وہ پہلے خود ان حدود کی پابندی کرتے ہیں اور پھر دوسروں سے ان کی پابندی کراتے ہیں۔ ان حدود کی نگہداشت ان کی زندگی کا مشن اور مقصودِ حیات بن جاتی ہے یہی ان کا ایمان کہلاتا ہے۔ یہ ایمان اس قدر پختہ ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی کشش انہیں اس راستے سے بہکا نہیں سکتی۔ قرآن کریم رہبانیت کی تعلیم نہیں دیتا۔ وہ بیوی بچوں کی محبت کو موجبِ تسکین و راحت اور قرۃ العین (آنکھوں کی ٹھنڈک) قرار دیتا ہے۔ مال و دولت کو زندگی کے قیام کا ذریعہ ٹھہراتا ہے۔ وہ پورے زور سے اعلان کرتا ہے کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی چیزوں کو حرام قرار دے؟ وہ کہتا ہے کہ یہ تمام چیزیں انسان کے لئے باعثِ کشش ہیں اور ان کے حصول کے لئے پوری پوری کوشش کرنی چاہیئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر ان میں سے کوئی کشش اس کے مقصدِ حیات (ایمان) کے راستے میں حائل ہو جائے تو یہی چیزیں اس کی تباہی کا موجب بن جاتی ہیں۔ وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔

اے رسول! ان سے کہدو کہ اگر تمہارے ماں باپ یا اولاد۔ تمہارے بہن بھائی، یا بیویاں، یا دیگر افرادِ خاندان۔ تمہارا مال و دولت، جسے تم نے کمایا ہے۔ تمہارا کاروبار جس کے مندا پڑ جانے سے تم خائف ہوتے ہو۔ تمہارے یہ محلات جنہیں تم اسقدر پسند کرتے ہو۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی تمہارے لئے خدا و رسول اور اس کے راستے میں جہاد سے زیادہ پرکشش ہو گئی تو پھر تم خدا کے فیصلے کا انتظار کرو۔ جو لوگ صحیح راستہ چھوڑ کر کسی دوسری طرف نکل جائیں، وہ کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔

اسلامی مملکت کا قیام ان لوگوں کے ہاتھوں عمل میں آتا ہے جن کے لئے دنیا کی کوئی کشش، حدود اللہ سے تجاوز کا موجب نہیں بنتی۔ وہ ان حدود کی پابندی اپنے اوپر خارج سے وارد کردہ تصور نہیں کرتے۔ یہ ان کی ذات کی پکار اور دل کا تقاضا ہوتا ہے۔ اسطرح وہ خود ہی اپنے اختیارات کو پابندِ حدود کر لیتے، اور پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ

بیقراری ہے کس قرار کے ساتھ
جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ

والسلام

طلوعِ اسلام کنونشن کا مقالہ

پروفیسر علاؤالدین اختر

اسلامی نظریاتی مُلک میں ترقی اور تعلیم کا مفہوم

(اور ان کا باہمی رابطہ)

حضرات! آپ کو یاد ہو گا پچھلے سال میں نے فکر اور احساس کی تعلیم و تربیت کے بارے میں آپ سے چند باتیں کی تھیں آج انہی باتوں کو کچھ آگے بڑھاؤں گا۔ پاکستان چونکہ ایک نظریاتی مملکت ہے اس لئے میں نے اسی خصوصیت کے لحاظ سے اُن راہ نما نقطوں کی نشاندہی کی تھی جنہیں بنیاد بنا کر تعلیمی اداروں میں فکر اور احساس کی تعلیم و تربیت کے خطوط استوار کرنا تھے تاکہ پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے جلو میں اس کی جغرافیائی سرحدیں خود بخود محفوظ اور مامون ہوتی رہیں اور ان کے وسیع ہونے کے امکان پیدا ہوں۔ تاریخ کے مطالعے نے مجھے یہی سکھایا ہے کہ نظریاتی سرحدوں کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ ملک جو نظریات کی خاطر وجود میں آتے ہیں، ان کی جغرافیائی سرحدیں بھی دائمی نہیں ہوتیں۔ ان کے گھٹنے بڑھنے کا انحصار نظریاتی سرحدوں کے ہیولے کے بننے اور بگڑنے پر ہے۔ میں چونکہ بنیادی طور پر فلسفہ اور نفسیات کا طالب علم ہوں اور تاریخ اور ادبیات کا مطالعہ صرف بطور شغف کرتا ہوں اور مذہب چونکہ میری گھٹی میں ہے اسی لئے انہی نقطوں کو ذہنی عمل کی دو سطحوں یعنی ادراکی (COGNITIVE) اور احساسی (AFFEOTIVE) پر پھیلا کر کچھ کر گذرنے کی راہ سجھائی تھی۔ اس کے بغیر میرے نزدیک اسلامی نظریاتی مملکت میں فکر اور احساس کی تعلیم و تربیت تعلیمی اداروں میں ممکن نہیں۔ یہ ساری باتیں میں نے اردو میں کی تھیں۔ اس لئے نہیں کہ اس محفل کا یہی دستور ہے۔ یہاں میں نے انگریزی میں عالمانہ مقالہ بھی پچھلے سال ہی سنا ہے۔ اردو میں باتیں میں نے عمداً کی تھیں اور ایسا کرنے کا جواز زبان کے نفسیاتی پس منظر کو قرار دیا تھا۔ میرے مشاہدے میں یہی آیا ہے کہ جب ہم اُس زبان کا سہارا لیتے ہیں جس کے توسط سے ہمارے ذہنوں میں چیزوں کے ہیولے بنتے اور اُبھرتے ہیں تو سننے والے کی آنکھ میں چمک پیدا ہوتی ہے اور چہرہ کھل اٹھتا ہے۔ مجھے اپنے آپ کو محبانِ اردو میں شمار کرانے کا بھی کوئی خاص شوق نہیں۔ میں اپنے ہم وطنوں سے اردو میں اس لئے بھی بات کرتا ہوں کہ میرے مطالعے اور تجربے نے مجھے سکھایا ہے کہ جو افراد اپنی سوچ دوسروں تک موثر طریق سے نہیں پہنچاتے وہ فکر کے نئے اسلوب وضع نہیں کر سکتے۔ احساس میں خلوص کو جنم نہیں دے سکتے اور عمل میں تسلسل نہیں رکھ سکتے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ آج کل کے (KNOWLEDGE EXPLOSION) کو دیکھتے ہوئے علم ہم پاکستانیوں کا بھی ہتھیار ہو جائے۔

خود غرضی کے اس دور میں خلوص ہماری ڈھال بن جائے اور یقین ہماری قوت اور پیہم عمل کا مرچشمہ اور وسیلہ تاکہ ہم سربلند ہو کر چلیں۔ وہ قوم جس کا رہبر اعظم حسن گفتار کو بھی صدقہ قرار دیتا ہو۔ یعنی مصیبت کو (WORD OFF) کرنے کا ذریعہ اور فلاح اور خیر کی راہیں کھل جانے کا سبب اور بشر۔ ذرا احتیاط سے لفظوں پر غور کیجئے گا۔ میں نے سوچ سمجھ کر یہ لفظ استعمال کئے ہیں۔ میں صدقے کے فلسفہ کو اسی طرح سمجھتا ہوں۔ چنانچہ جب حسن گفتار بھی شادمانی کا ذریعہ، ثمر اور اظہار ہو، تو تعلیم اور ترقی کا مفہوم سمجھ لینا اور سمجھا دینا آسان بھی ہے اور بے حد مشکل بھی۔ آسان جب ہو گا جب فکر کے سارے سلسلے کھلے اور روشن اور صاف ہوں گے۔ احساسات اسی وسیع النظری کا پتہ دیں اور سوچ اور احساس عمل اور مسلسل عمل میں ڈھلتے جائیں اور ڈھلتے رہیں۔ ترقی اور تعلیم کے مابین جو رشتے ہوتے ہیں انہیں سمجھنا مشکل اس وقت ہوتا ہے جب کوئی شخص تذبذب کا شکار ہو۔ تذبذب عموماً اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ذہنی افق گدلا ہو جائے، احساس میں گہرائی کم ہو اور عملی محرکات مفلوج ہو جائیں۔ میرے ذہن کے کینوس پر پاکستانی معاشرت کی جب بھی کوئی تصویر بنی وہ کچھ ایسی تھی جس سے کم و بیش یوں لگا کہ یا تو ہم ترقی کے معنی سمجھ نہیں سکے اور تعلیم کے مفہوم کو پا نہیں سکے، یا اگر وہ ہم پر عیاں ہوئے تو اُن سے ہم نے وہی مراد لیا جو یورپ یا امریکہ کی "اقتصادیات زدہ" اقوام مراد لیتی رہی ہیں اور جس سے غالباً وہ خود عاجز آ گئی ہیں۔ یا ترقی کو ہم نے ان راہوں کے توسط سے تلاش کرنے کی کوشش کی جو غیر دینی نظریاتی ملکوں نے متعین کی ہیں۔ یہ ہماری بھول ہے۔ ہمیں یاد رکھنا ہو گا کہ ترقی کا مفہوم انہی دائروں کے اندر اُن وسیع خطوط کے لحاظ سے متعین کرنا ہو گا جن کی روشنی میں ہم اپنے اور اپنے بچوں کے فکر اور احساس کی تربیت کرنا چاہتے ہیں۔ ان خطوط کے بنیادی نقطے ہی ترقی اور تعلیم کے مابین رشتوں کو منور کرتے ہیں۔ اُن بنیادی نقطوں کو پچھلے سال ہم زیر بحث لا چکے ہیں جو کسی ملک کو نظریاتی ملک کا اعزاز بخشتے ہیں۔ یہ نقطے کیا تھے، اس کی نشاندہی بھی ہم نے کر دی تھی محض یاددہانی کے لئے نہایت مختصر لفظوں میں یہ سمجھ لیجئے کہ وہ نقطے یہ تھے کہ ہم ایک اسلامی مملکت کے باشندے ہیں جہاں قرآنی اصول اور قرآنی احکام کی حکمرانی ہو گی۔ سب انسان بہ حیثیت انسان برابر سمجھے جائینگے۔ رنگ، نسل اور دنیاوی وجاہت وجہ امتیاز نہ ہو گی۔ وجہ امتیاز اچھے اعمال اور اخلاق ہوں گے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ خدا کی ملکیت ہے جو نہایت مہربان اور رحم والا ہے۔ انسان صرف اس کا امین ہے۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا جو حساب کتاب کا دن ہو گا۔ اس دن وہی سربلند ہوں گے جنہوں نے قرآن کی تعلیمات پر غور کرتے ہوئے ایک دوسرے کی نشوونما کی ذمہ داری نبھائی ہو گی۔ میری یہ باتیں پرویز صاحب کو بھلی لگی تھیں۔ میری ان کے ساتھ بالمشافہ گفتگو کم ہی ہوئی ہے۔ مگر کنونشن کے اجلاس میں آخری بنچوں پر بیٹھ کر میں نے اکثر یہ محسوس کیا کہ یہ محفل ایسی ہے جہاں مذہب پر غور و فکر کی واقعی اجازت ہے۔ ہر شخص یہاں کچھ کہہ سکتا ہے، سیکھ سکتا ہے۔ مزید سیکھنے کا متمنی رہتا ہے۔ غلطی کا اقرار کر سکتا ہے اور معاف کر دیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا پچھلی بار میں نے خود گزارش کر کے کچھ کہنے کا موقعہ حاصل کیا تھا۔ اس بار جب میرے برادر عزیز[1] نے کوئی ہفتہ دس دن پہلے پرویز صاحب کا پیغام دیا کہ مجھے کچھ کہنا ہو گا تو مجھے خوشی ہوئی کہ ان کا حکم پہنچا۔ میں

---

[1] محترم ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

نے ابھی عرض کیا تھا کہ مذہب میری گھٹی میں ہے۔ میرا بچپن اور لڑکپن بڑے دین دار ماحول میں گزرا ہے۔ وہاں احترام اور محبت کے یہی دستور تھے کہ بزرگوں کی محبت چاہتے ہو تو ان کے احکام بجا لاؤ۔ اور میرے بزرگ جب احکام دیتے تو یوں لگتا کہ دامن شفقت سے بھر گیا ہو۔ پرویز صاحب کے احکام ہوں اور بجا آوری نہ ہو؟ یہ تو فکر اور احساس کی تربیت کا معاملہ ہے۔ مگر میرے لئے مشکل یہ ہوئی کہ پرویز صاحب کی تو عادت ہے کہ وہ عقل و دل کی بات فہم اور جذبے سے کہتے ہیں۔ یہ ان کی تحریروں سے ظاہر ہے۔ میری ذاتی واقفیت بہت ہی کم ہے۔ مگر یہاں افتاد یہ تھی کہ خوب اور ناخوب کی بحث میں صاف صاف حق گوئی ہو تو کیونکر اور مصلحت کوشی ہو تو کیوں؟ عافیت اسی میں دیکھی کہ پچھلے سال کی باتوں کو آگے بڑھایا جائے۔ چنانچہ بڑھا رہا ہوں ان باتوں کو آگے۔ حق گوئی میں لوگ ٹھوکر بھی کھا جاتے ہیں۔ بہک بھی جاتے ہیں۔ اور مردانِ حق گو نے انہیں ٹوکا بھی ہے، روکا بھی ہے اور پکڑا بھی ہے۔ ان باتوں کو آگے بڑھانے کا ایک سبب یہ بات بھی ہوئی ہے کہ پچھلے سال اپنے ملک میں جس نظریاتی فلسفے کی طرف میں نے دھیان دلایا تھا اور جس کے بنیادی نقطے ابھی ہم نے دہرائے ہیں اور جس میں ہم نے کہا تھا کہ تعلیمی نصابات اگر اس کی روشنی میں مرتب نہ دیئے گئے تو پاکستانی تعلیمی اداروں میں فکر اور احساس پر ہمارے تعلیمی فلسفے کی چھاپ کبھی نہ لگے گی۔ اپنا خدشہ ظاہر کیا تھا کہ موجودہ تعلیمی نظام کے تحت ہمارے بچے اور نوجوان محض نام کے پاکستانی رہیں گے اور وہ سرِ لاالٰہ سے کبھی واقف نہ ہو سکیں گے۔ خوشی کی بات ہے کہ ہم باتوں سے کچھ آگے بھی بڑھے ہیں اور اگر میں یہ کہوں تو کوئی سیاست کی بات نہ ہوگی کہ موجودہ دور کی عوامی حکومت میں تعلیم کے میدان میں کچھ کہنے سننے کی جتنی آزادی اور ضبط ہے پہلے کبھی نہ تھی۔ بات اگر سلیقے سے کی جائے اور ہوشمندی سے اسے بار بار دہرایا بھی جائے تو وزارتِ تعلیم سنتی ہے بلکہ مان بھی لیتی ہے۔ افہام و تفہیم اسی کا نام ہے۔ غالباً ابتدائی جماعتوں کے نصابات کا جو خاکہ تیار کیا گیا ہے اس میں ان عناصر کا بڑی حد تک خیال رکھا گیا ہے جو ہمارے نزدیک فکر اور احساس کی تعلیم و تربیت کے لئے اہمیت کے حامل تھے[1]۔ نصابات کے ان خاکوں کو آزمانے کا اہتمام بھی کیا جا رہا ہے تاکہ انہیں نافذ کر دیا جائے۔ چونکہ میرا تعلق تعلیم سے ہے اس لئے میں نے جو کچھ کہا ہے اپنے تجربہ کی بنا پر کہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میری گزشتہ باتیں بالخصوص تعلیمی ماحول کی بابت تھیں۔ ان میں معاشرے کے دیگر احوال و ظروف کا ذکر یونہی تذکرۃً آیا تھا۔ آج بھی میری باتوں کا محور آپ دیکھ رہے ہیں۔ تعلیمی درسگاہیں ہی ہیں۔ ان سے باہر جھانکنے کی کوشش سرسری ہے۔ کسی اگلی فرصت میں ان دونوں کو براہِ راست ایک دوسرے میں سمو دوں گا تاکہ وہ خاکہ کماحقہٗ پورا ہو جائے جس کے حوالے سے میں اپنی اس نظریاتی مملکت میں (COMMITTED و DEDICATED) لوگوں کو قطار اندر قطار دیکھنے کا آرزومند ہوں گا۔ میں آج بھی آپ سے باتیں اردو میں کر رہا ہوں حالانکہ بعض اوقات ہم لوگ جو انگریزی پڑھتے پڑھاتے اور لکھتے رہتے ہوں انہیں انگریزی زیادہ آسان رہتی ہے۔ ایک تو وہاں لفظوں میں تکلفات کی گنجائش نہیں

---

[1] خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ ابھی تک یہ نصاب ہماری نظروں سے نہیں گزرا۔ (طلوع اسلام)

دوسرے اگر بات "گول مول" طریق سے کرنا ہو تو زیادہ دِقت پیش نہیں آتی۔ اردو میں تکلفات سے بچنا تو ممکن ہے مگر بات گول مول کرنا خاصی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے زبان کے سلسلے میں میں لطیفے کی یہ بات ہمیشہ اپنے آپ کو یاد دلاتا رہتا ہوں کہ زبان کسی قوم کے ہاتھوں کم تشکیل پاتی ہے۔ قوم زبان کی زیادہ مرہونِ منت ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ قوم کی سیرت اور کردار میں جو اہمیت زبان کو حاصل ہے وہ کسی اور شے کو نہیں۔ اگر آپ کسی بچے کو اوائلِ عمر ہی سے اپنوں سے نکال کر غیروں کے سپرد کر دیں تو عین ممکن ہے کہ وہ غیروں کا ہی ثناخواں ہو جائے۔ ان کی زبان کی بدولت انہی کی روایات اور امتیازی شان کے گن گائے۔ مگر وہ بچہ جو اپنی عمر کے پہلے چند سال اپنوں میں گزار چکا ہو جس کے حلق میں اپنی زبان کا رس ٹپکتا رہا ہو اس کے لئے غیر ملکی زبان کی وساطت سے خیالات کی ماہیت کو پالنا فطری نہیں ہو سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم اپنے بچوں اور نوجوانوں کو اس طور تعلیم دیں کہ وہ اپنوں اور غیروں کو پہچانیں اور اس کا برملا اقرار و اعلان بھی کر سکیں کہ کون ان کا اپنا ہے اور کون ان کا اپنا نہیں اور چونکہ وہ رب العالمین کو ماننے والے ہوں گے اور اس کی اطاعت رحمۃ اللعالمینؐ کے توسط سے کریں گے، وہ اپنوں سے والہانہ محبت رکھتے ہوئے بھی غیروں سے "خدا واسطے کا بیر" نہ رکھیں گے۔ منافقت کے سائے نہ ان کے فکر پر سایہ افگن ہوں گے اور نہ ان کے احساسات اس سے داغدار ہوں گے۔ ذرا غور کیجئے گا اس (PHRASE) پر۔ "خدا واسطے کا بیر" کس ڈھٹائی سے میں نے بھی اسے استعمال کر لیا ہے۔ کیا یہ (IRONY OF EVENTS) نہیں کہ اسلامی نظریاتی ملک میں فکر اور احساس کی تربیت کا ذکر کرتے ہوئے اور ترقی اور تعلیم کے باہمی رابطوں کا مفہوم سمجھاتے وقت بھی ہم "خدا واسطے کا بیر" جیسا (PHRASE) بے سوچے سمجھے زبان پر لے آئیں۔ اسلامی نظریاتی مملکت میں "خدا واسطے کا بیر" ہوگا۔ یہ بیر خدا کے لئے ہوگا۔ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جو اس کے بَیری ہوں گے۔ اس کے بَیری وہی لوگ ہوتے ہیں جو اس کی زمین پر فساد پھیلاتے ہیں۔ اس کی ملکیت کو اپنی ملکیت سمجھ کر خود خدا بن بیٹھتے ہیں۔ لہٰذا ہمارے ہاں زبان اور بیان کے تقدس کے تقاضے دیگر ہوں گے۔ یہاں "خدا واسطے کا بیر" بلا جواز نہ ہوگا۔ اس کا جواز خدا کی دی ہوئی ہدایات کی روشنی میں تلاش کیا جائے گا۔ اور زبان اس قسم کی لغزش نہ کرے گی۔ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ کسی خاص معاشرے کے افراد سے بات کرتے وقت ان تک اپنی بات پہنچانے کا مؤثر انداز یہی ہے کہ اس زبان کا سہارا لیا جائے جو اس معاشرے کے خواص ہی نہیں عوام بھی سمجھتے ہوں۔ اور عوام آج ہی طاقت نہیں ہیں وہ ہمیشہ طاقت کا سرچشمہ اور امین ہو گئے ہیں[1]۔ عوام کا طاقت کا سرچشمہ ہونا میرے اور آپ کے عام مشاہدے کی بات ہے۔ ان کا طاقت کا امین رہنا ذرا سمجھنے کی بات ہے اور یہ سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ عوام کی (COMPOSITION) کو دیکھا جائے اور یہ معلوم کیا جائے کہ کیا چیز ان کو شیر و شکر کرتی ہے۔ جب یہ دونوں باتیں معلوم ہو جائیں گی تو یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ ان کے نزدیک طاقت کیا ہوتی ہے۔ ان دونوں باتوں کو سمجھنے کے لئے اس (IDEOLOGY) کا جائزہ لینا ہوگا۔ یعنی ان فکری نظریات اور حیات

---

[1] طاقت سے مراد اقتدار نہیں بلکہ قوم کی قوت ہے۔ (طلوعِ اسلام)

کو بالتفصیل دیکھنا ہوگا جو عوام کی سوچ اور جذبات کی آبیاری کرتے ہیں۔ عام نظریاتی ملک اور اسلامی نظریاتی ملک یا دیگر مروّجہ و غیر مروّجہ آئینوں کے تحت کام کرنے والے ملکوں میں تعلیم کی راہیں مختلف ہونگی۔ اور ترقی کا مفہوم جداگانہ۔ ہمارے نظریاتی ملک میں تعلیم خواہ (HUMANITIES) کی ہو خواہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی۔ دونوں صورتوں میں مقصود بالذات نہ ہوگی۔ دونوں کے سامنے ایک (VISION) ہوگا کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ خدا کا ہے۔ اس لئے مقدور بھر فائدہ اٹھانا ہمارا فرض اور ذمہ داری ہے ترقی نقط (PER CAPITA INCOME) کے بڑھنے کا نام نہ ہوگا۔ اعداد و شمار کا گورکھ دھندا نہ ہوگا۔ ترقی صرف مادی آسائشوں کی فراوانی تک بھی محدود نہ ہوگی۔ صدق اور سخاوت کی بلندیوں کو چھونے کا نام بھی ترقی ہوگا۔ تمام تر جاہ و جلال کے ہوتے ہوئے فقر اور استغنا سے کام لینا بھی ترقی میں شمار ہوگا۔ اپنے اس فرض اور ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے ہمیں لسانی اور معاشرتی علوم کے ساتھ فنی اور سائنسی علوم کی تعلیم کا بھی اہتمام کرنا ہوگا۔ صنعتی معیشت کو سنبھالنے اور اسے فروغ دینے کے لئے صنعتی انتظامیات اور کاروباری امور میں مہارت حاصل کرنے کے جو التزامات درکار ہوں گے ان کا بھی بند و بست کرنا ہوگا۔ کثیر دیہی آبادی کے پیش نظر زراعتی پسماندگی کا مداوا کرنا ہوگا۔ عام بھوک ننگ اور بیماری کو دور کرنے کی تدابیر کرنا ہوں گی۔ طبقاتی تقسیم کو ختم کر کے حقیقی مساوات اور اخوت کا نمونہ پیش کرنا ہوگا۔ سچی سادگی اختیار کرنا ہوگی۔ جہالت کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ دیکھنا ہوگا کہ خواہ کتنا بڑا مرتبہ اور مقام ملے طبیعت میں رعونت پیدا نہ ہو۔ قارون ایسی دولت مل جائے تو اسے لوگوں کی بھلائی میں صرف کیا جائے عقل و شعور ملیں تو ان سے بھی لوگوں کی خدمت کی جائے۔ شاہوں کے جلال اور غیروں کی تونت سے ڈر نہ لگے۔۔۔ اپنی (CONVICTION) پر مکمل اعتماد ناساعد حالات کے کسی ریلے میں نہ بہے۔ یہ سب کچھ اس لئے کرنا ہوگا کہ کبر و نخوت کے سارے بت ٹوٹ جائیں۔ صدق ہی سفارش ہو جائے اور احترام آدمیت ہماری امتیازی مختصر ایوں کہئے کہ کردار سازی کا یہ کام اس لئے کرنا ہوگا کہ اسلامی نظریاتی ملک میں سوائے خدائے لم یزل کے کوئی اور خدا تصور نہ کیا جا سکے۔ کردار سازی کا یہ سارا کام کیا تعلیمی اداروں سے لینا ہوگا یا معاشرے کے دیگر (INSTITUTIONS) کو بھی اس میں شامل کرنا ہوگا کہ ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے جو ایک اسلامی نظریاتی ملک کے لائق ہو۔ یہ بڑا ٹیڑھا سوال ہے۔ اس بحث میں الجھے بغیر [illegible] ایسے کام تنہا تعلیمی اداروں کے کرنے کے ہیں کہ نہیں ہمیں یہ کہوں گا کہ ابتدا تعلیمی اداروں سے ہی ہو [illegible] بیئے بچپن سنور جائے تو جوانی سنبھلتی ہے۔ جوانی سنبھلتی ہے تو بڑھاپا مسکراتا ہے۔ روشنی تعلیمی اداروں سے ہی نکلتی پھیلتی اور اندھیروں کو دور کرتی ہے۔ تعلیم ہوگی تو ہم عصر تحریکوں کا جائزہ لیا جا سکے گا۔ ثقافتی یلغاریں (NERVES) پر سوار نہ ہونگی۔ خوف زدہ نہ کر سکیں گی۔ علاقائی عصبیتوں کو سمجھا جائے گا۔ ملی ثقافتوں کی چھان پھٹک ہوگی۔ بین الاقوامی مقتضیات کو پرکھا جا سکے گا۔ تعلیم ہی محنت اور احترام کے صحیح پیمانے وضع کرتی ہے۔ علم جب ہمارا ہتھیار ہو جائے گا تو ہم اپنی بقا کے خود ضامن ہوں گے۔ کردار میں بلندی اپنے وسائل پر بھروسہ ہی نہیں سکھاتی، انہیں وسیع کرنے، خود کفیل ہونے کا درس بھی دیتی ہے۔

جینے کی آرزو اور مرنے کا سلیقہ بھی کردار کی پختگی ہی دے سکتی ہے۔ اس لئے تعلیمی اداروں میں ہی اولاً نگاہوں میں وسعت پیدا کرنے کا اہتمام کرنا ہوگا۔ وہیں بچوں کو اس قابل بنانا ہوگا کہ وہ قومی خوشحالی کا وسیلہ بن سکیں۔ وہیں ان کے اطوار ایسے بنانے ہوں گے کہ وہ عادتاً اصولوں کی پاسداری کا حوصلہ پائیں اور اپنے اپنے کام کو خوش اسلوبی سے کرنے کی لگن۔ ترقی جو طمانیتِ قلب کی ضامن ہو اور خوشحالی کا پیش خیمہ اور ترقی جو سلطانِ روح ہو اور بداعمالی کا ذریعہ اور جواز ـــ دونوں میں تمیز کرنے کی تعلیم اور توفیق بھی درس گاہ میں استاد کے سامنے بیٹھنے ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ المختصر، تعلیم معاشرہ کی بقا اور صحت کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنی ایک انسان کے لئے صاف ستھری ہوا اور مصفا پانی۔ اس لئے نظریاتی ملک میں فکر اور احساس کی تعلیم دینا، تعلیم اور ترقی کا مفہوم سمجھانا، اور ان کے باہمی روابط کو سامنے رکھ کر شب و روز بسر کرنے کے انداز سکھانا تعلیمی اداروں سے ہی شروع ہونا چاہیئے۔ ان اداروں سے باہر ابلاغ کے جتنے ادارے ہیں، ان میں جھانکا جائے تو مایوسی گھیر لیتی ہے۔ مگر اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں حال ہی میں ایک کرن روشنی کی نظر آئی ہے کہ ابلاغ کا ایک ذریعہ تعلیم کی نگرانی میں دے دیا گیا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ یہاں تعلیم والے دوسروں کے تجربوں سے فائدہ اٹھائیں گے اور تعلیم و تربیت کے دیگر (INSTITUTIONS) جن پر گو اپنوں ہی کا قبضہ ہے، کی مثال کو مشعلِ راہ بنائیں گے۔ بلکہ ایشیا کے بعض نو آزاد اداروں نے ابلاغ کے اس ذریعے سے جو کام لیا ہے اسے سامنے رکھیں گے۔ ہمارے ہاں ان اداروں نے خصوصاً جن کا تعلق صوت۔ آہنگ اور تصویر سے ہے، اپنی ہر قدر کی بے حرمتی اکثر کی ہے۔ تعلیم بے حرمتی کرنے کا درس کبھی نہیں دیتی۔ ہاں اگر بادہ و ساغر کہے بغیر بات نہ بنتی ہو تو بادہ و ساغر کے سہارے مشاہدہ حق کی گفتگو کرنے میں تعلیم کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ ان اداروں کا اول کام تفریح کا سامان بہم پہنچانا ہے۔ تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنا ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ابھی تو ان میں سے کوئی ادارہ بھی اس طرح (GEAR) نہیں کیا گیا کہ اس سے تعلیمی امور میں مدد لی جا سکے۔ اسلامی نظریاتی ملک میں تفریح اور دل بہلاوے کی بنا ہی نہیں ہوگی۔ ہاں ان کا انتظام اپنی قدروں کے اندر رہ کر کرنا ہوگا، ان کا منہ چڑا کر نہیں۔ پاکستان کی نظریاتی اساس سے نوجوانوں کو روشناس کرانے کا کام تعلیمی اداروں کے علاوہ انہی اداروں کو کرنا ہوگا۔ نوجوانوں کی کرداری بے بضاعتی صرف تعلیمی اداروں کی پیدا کردہ نہیں ہے۔ اس لئے معاشرے کے دیگر ادارے خصوصاً (FAMILY) اور RELIGIOUS AND POLITICAL (INSTITUTIONS) سبھی کو پاکستان کے تاریخی محرکات اور نظریات سے واقفیت اور ان کا عملی ثبوت دینا ہوگا۔ زبان و بیان سے کسی چیز کا اقرار کرنے اور عمل و فعل میں اس کی نفی کرنے سے بے بضاعتی اور بے بصیرتی ہی حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں ہر فرد کو قول و فعل سے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ ہجرت ایک خطہ زمین سے کسی دوسرے خطہ زمین میں منتقل ہو جانے کا ہی نام نہیں۔ سب سے اچھی ہجرت تو وہ ہے جس میں انسان ہر اس شے سے کنارہ کش ہو جائے جو اس کے پروردگار کو پسند نہیں ہے۔ ہمیں جان لینا ہوگا کہ ہمارے رب کو نہ بے عملی پسند ہے اور نہ منافقت۔ اور یہ کہ منافق وہی ہے جس کے

قول و فعل میں فرق ہے اور عمل و عقائد میں بُعد و تضاد۔ آج کل کے پُر فشار زمانے میں مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے صاحبِ اختیار یا حاجت مند ہر حربہ استعمال کر لیتا ہے۔ مگر ہمارے نظریاتی مملکت میں جھوٹ، دھوکا اور ظلم زندگی کے کسی شعبے میں کہیں روا نہیں رکھے جائیں گے۔ ہم نہ شترمرغ ہوں گے کہ خطرہ دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں کہ خطرہ ٹل گیا، اور نہ شترِ بے مہار کہ ہر کسی سے الجھتے رہیں۔ یا یہ ہم یہ کبھی نہ بھولیں گے کہ جرمِ ضعیفی کی سزا موت ہوتی ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا ہو گا کہ بآوازِ بلند، بلاخوف نظریات کا پرچار کرنا اور پرچار کا برسرِعام عملی مظاہرہ کرنے کے لئے کسی عمر کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ "عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد" کے فلسفے کو اسی طور ذہن نشین کرنا ہو گا۔ مسلمان موت سے کبھی نہیں ڈرتا۔ مگر مسلمان بچوں کو یہ بھی بتانا ہو گا کہ (IDEOLOGY) کے برحق ہونے کی (PROJECTION) سے اگر کبھی کوئی روکے تو اتنی مادی قوت موجود ہو کہ اس کا منہ توڑ جواب دیا جا سکے۔ اس قوت کے استعمال پر قدم قدم قدغن ہو گی۔ مگر نظریاتی ملک میں اس کی طرف سے غفلت ہو تو نظریاتی اور جغرافیائی دونوں قسم کی سرحدیں خطرے میں ہوں گی اور چونکہ نظریاتی ملک میں تعلیم تمام تر شخصیت کی پرورش اور بالیدگی ہوتی ہے اس لئے کوئی فردِ وعدۂ فردا کو دل کے نہاں خانے میں رکھ کر کارِ امروز سے حال اور مستقبل سنوارنے سے غافل نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہر شخص یہاں (COMITTED) ہو گا۔ ہر آن اپنی (COMMITMENT) کے بارے میں (ALIVE) رہے گا اور ہر لحظہ ان کے لئے (ACTIVE) ہو گا۔ برصغیر ہند و پاکستان کے مسلمانوں سے ہماری (COMMITMENTS) یہ تھیں کہ پاکستان میں قرآن اور سنت کے احکام نافذ ہوں گے اور عملی طور پر جاری و ساری رکھے جا سکیں گے۔ جس کسی کو اس کا وسیلہ ہونا نصیب ہو گا وہ اسے امانت سمجھ کر اس میں خیانت نہیں کرے گا۔ میں مایوس نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری درس گاہیں اور دیگر معاشرتی ادارے مل جل کر یہ کام سرانجام دے لیں گے۔ ابتدا، پرائمری اور ثانوی تعلیمی اداروں میں درس و تدریس سے ہو گی۔ باقی ادارے جن میں اعلیٰ تعلیمی ادارے بھی شامل ہوں گے، وہ اس کام کو آگے بڑھا جائیں گے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیمی اداروں میں اس کام کی صورت کیسے ہو گی، اس کی بابت ابھی ہم نے بات کی ہے۔ باقی ادارے یہ کام کیسے کریں گے، یا یوں کہئے کہ وسیع معاشرے میں یہ کام کیسے ہو گا۔ یعنی (COMMITMENTS) کے لئے دیدہ و دل کیسے حاضر کئے جائیں گے۔ فہم و فراست سے کام کیونکر لیا جائے گا اور ہر طرح کے دیگر وسائل کب، کہاں سے میسر آئیں گے اور ان سے کام کیسے لینا ہو گا، اسکے بارے میں ابھی ابھی میں نے عرض کیا کہ فرصت ملی تو کسی اگلی نشست میں بات چیت ہو گی۔ اسوقت اجازت دیں کہ اپنی آج کی بات چیت خدا کے ایک بندے کی دعا پر ختم کروں۔ اس برگزیدہ ہستی کو ہم سب سید عبدالقادر جیلانیؒ کے نام نامی سے بصد احترام و عقیدت یاد کرتے ہیں۔ میرے نزدیک ایک اسلامی نظریاتی ملک کے لئے اس سے بہتر دعا ہو ہی نہیں سکتی خصوصاً جب کہ تعلیم و ترقی کے مفہوم اور فکر اور احساس کی تربیت کا ہو تو اس سے بہتر شاید ہی کوئی دعا ہو۔ انکی دعا کے وہ الفاظ جن کا ہماری آج کی بات چیت سے تعلق ہے، کچھ یوں ہیں۔ میں یادداشت سے کام لے رہا ہوں کہیں تھوڑی سی بھی کچھ غلطی ہو جائے تو معاف کر دیجئے گا۔ وہ فرماتے ہیں۔ "اے خدا ہمیں توفیق دے کہ ہم ریاکاروں کے دبدبے کو توڑ دیں۔ اے خدا! یا تو انکی اصلاح کر دے یا ان کو فنا کر دے اے خدا!" آمین۔

برخورداران قوم

دو چار تازہ ترین خبریں

(۱) "لاہور ۱۴ جنوری۔ پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے عہدیداروں نے آج صبح وائس چانسلر کی عدم موجودگی میں دروازہ توڑ کر ان کے دفتر پر قبضہ کر لیا اور یونین کے صدر فرید پراچہ نے وائس چانسلر کا عہدہ سنبھال کر احکام جاری کرنے شروع کر دیئے۔ انہوں نے رجسٹرار اور دیگر بدعنوان افسروں کے خلاف ایک تحقیقاتی کمیٹی تشکیل دی۔ کمیٹی یونین ہی کے عہدیداروں پر مشتمل ہے اور جس کے چیئرمین سٹوڈنٹس یونین کے جنرل سیکرٹری عبدالشکور ہیں۔ شعبہ آئی۔ای۔آر کے تین اساتذہ کی معطلی کے فیصلے پر فوری عملدرآمد کا حکم دیا اور دفتر کے لئے ایک چپڑاسی مقرر کیا اور بعض پروفیسروں کو ترقی دینے کی یقین دہانی کرائی۔ فرید پراچہ نے وائس چانسلر کے دفتر پر قبضہ کرتے ہی ایم۔ اے۔ ایم۔ ایس سی کے امتحانات پندرہ اپریل تک ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔

واضح ہو کہ پنجاب یونیورسٹی کے قائم مقام وائس چانسلر پروفیسر سراج آج صبح تقریباً گیارہ بجے ایم۔او۔ کالج میں طلبہ کو لیکچر دینے گئے ہوئے تھے۔ اسی دوران یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے عہدیداران تیس چالیس طلباء کے ہمراہ وائس چانسلر کے دفتر میں آ گئے اور چپڑاسی کو وائس چانسلر کا کمرہ کھولنے پر مجبور کیا گیا۔ چپڑاسی نے انکار کر دیا جس پر طلبہ دروازے کو توڑ کر اندر گھس گئے اور کمرے پر قبضہ کر لیا۔ وہ تقریباً پون گھنٹہ اس پر قابض رہے اور بعد ازاں چلے گئے۔ طلبہ نے اعلان کیا کہ وہ کل پھر وائس چانسلر کے دفتر پر قبضہ کریں گے۔"

(امروز۔ ۱۵ جنوری ۱۹۷۴ء)

(۲) "پشاور۔ ۱۴ جنوری۔ پشاور یونیورسٹی کے طلباء نے آج سول سیکرٹریٹ اور گورنر ہاؤس کے سامنے مظاہروں سے اپنی ہڑتال کا آغاز کر دیا ہے۔ مظاہرین نے سٹریٹ لائٹوں، بنکوں کے اشتہاری بورڈز اور ایک مقامی سینما پر پتھراؤ بھی کیا جس سے بھاری مالی نقصان ہوا۔ ہڑتال کا آغاز یونیورسٹی کیمپس سے ایک جلوس کی شکل میں ہوا جو مارچ کرتا ہوا گورنر ہاؤس گیا۔ کئی مقامات پر طالب علم رہنماؤں نے جلوس سے خطاب کیا۔ سول سیکرٹریٹ کے سامنے مقررین نے متعلقہ حکام سے مطالبہ کیا کہ ان کے مطالبات چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تسلیم کئے جائیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ وہ مطالبات منوائے بغیر ہڑتال ختم نہیں کریں گے۔"

(امروز۔ ۱۵ جنوری ۱۹۷۴ء)

---

(۳) "ملتان۔ ۱۷ جنوری۔ پولیس نے آج مقامی پاک ہند لینڈ ٹیکنیکل ٹریننگ سنٹر کے نو طلباء کو گرفتار کر لیا ہے۔ پولیس کے بیان کے مطابق، سنٹر کے طلباء کی یونین کے انتخابات ہو رہے تھے۔ طلباء کے ایک گروپ نے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ انہوں نے کالج کا گھیراؤ کر لیا اور مبینہ طور پر خشت باری بھی کی۔ انہوں نے ملتان۔ خانیوال سڑک پر بھی سنگباری کی اور کچھ بسوں کو روک لیا۔ پرنسپل کی درخواست پر پولیس کالج کے احاطہ میں پہنچی اور نو طلباء کو گرفتار کر لیا۔

(پاکستان ٹائمز۔ ۱۸ جنوری ۱۹۷۴ء)

یہی نونہالانِ قوم چند برسوں کے بعد ملتِ پاکستانیہ بن جائیں گے؛ اور پھر ہم سب اس "قوم" کا رونا روئیں گے۔

طلوعِ اسلام کنونشن کا مقالہ

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

مرض لاعلاج نہیں

ادارہ طلوع اسلام کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے یہ موقع دیا کہ آپ تک اپنے خیالات پہنچا سکوں۔ آپ کو اگر مجھ سے اتفاق ہو تو پھر اپنے ذہن سے سوچیئے کہ ہمارا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیئے۔ اگر اختلاف ہو تو آپ کو اس کا حق ہے۔

ہزار ہم سخنی ہو ۔ ہزار ہم نظری
مقام جنبشِ ابرو نکل ہی آتے ہیں

مگر اپنے طور پر اس سے بہتر کوئی طریقے ضرور سوچیئے اور انہیں عام کیجئے۔ ہر نئی سوچ، ہر نیا خیال وہ ننھی سی کنکری ہے جو وقت کے ٹھہرے ہوئے تالاب میں پھیلتے بڑھتے ہوئے دائرے پیدا کرتی ہے، کچھ اضطراب پیدا کرتی ہے اور ہر اضطراب عمل کی نئی راہ سجھانے کا موجب ہو سکتا ہے۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے سال دو بعد ہی ہم اپنے رہنماؤں سے یہ سنتے چلے آ رہے ہیں کہ یہ قافلہ اپنی راہ سے بھٹک گیا ہے اور ہم ہر نئے آنے والے سے امیدیں باندھتے رہے کہ شاید اس بھٹکے ہوئے آہو کو یہ نیا رہنما سوئے حرم لے جائے مگر ہم ـــ عوام نے دیکھا کہ ہر نیا آنے والا اسی پرانی روش پر گامزن رہا۔ پگڈنڈیاں بدلیں مگر قافلے کا رُخ درست سمت نہ ہوا۔ حالات نے کبھی خوشگوار پلٹا نہ کھایا۔ اگر ایسا کچھ وقت کے لئے محسوس ہوا بھی تو وہ ایک بہت ہی عارضی سا وقفہ ثابت ہوا۔ اندھیرے میں بجلی چمکے تو لمحاتی سی روشنی کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ تاریکی اور گہری ہو گئی ہے۔ یہی حال ہمارا وقفے وقفے کے بعد ہوتا رہا ہے اور ہم آج بھی اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔

صحیح راستے پر آنے کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ معلوم کریں کہ ہم بھٹکے کہاں سے تھے۔ کون سا موڑ تھا جو ہم نے غلط کاٹا تھا۔ اس کے بعد ہی ہم صحیح راستے کا سراغ پا سکتے ہیں۔ اَصلح سے پہلے تائب کی سٹیج آتی ہے۔ جب تک بھٹکا ہوا قافلہ اس موڑ تک واپس نہ آئے گا جہاں سے وہ اپنی اس شاہراہ سے ہٹ گیا جو اُسے منزلِ مقصود کی طرف لے جانے والی تھی اس وقت تک وہ صحیح راستے پر گامزن نہیں ہو سکتا۔

قیامِ پاکستان کی تحریک کے وقت بھی اور اس کے بعد ہم یہ نعرے سنتے رہے۔ پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ۔ اور ہر آنے والے نے یہ مژدہ سنایا کہ ہم یہاں اسلامی معاشرتی نظام، اسلامی عدل و مساوات قائم کرنا چاہتے ہیں۔ کسی نے یہ جراٴت نہیں کی کہ اس سے اختلاف کرے، سوائے مارکسیت گزیدہ چند نفوس نے۔

اور وہ بھی برملا اس کا اظہار بڑی مدت تک نہ کر سکے۔ (یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جہاں تک مجھے یاد ہے اور ایسی چیزیں جو دل کو دکھ پہنچائیں آسانی سے بھلائی نہیں جا سکتیں)۔ میں نے ایک بار ایک اخباری رپورٹ دیکھی تھی جس میں بزنجو صاحب نے کہا تھا کہ اسلام وسلام کچھ نہیں۔ ہم یہاں مارکسی سوشلزم نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ (افسوس ہے کہ میں اس رپورٹ کو محفوظ نہیں کر سکا۔ اُس زمانے میں بزنجو صاحب کوئی ایسے اہم آدمی بھی نہ تھے اور نیشنل عوامی پارٹی بھی بڑا غیر نمایاں سا تھا)

جب سبھی یہ کہتے تھے کہ یہ خطۂ زمین اسلامی نظام نافذ کرنے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ اور اس بات پہ کوئی اختلاف نہ تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ آج تک کوئی بھی اس منزل کی طرف نہ بڑھ سکا۔ وہ کون سی رکاوٹیں تھیں جنہیں دور کرنا کسی کے بس کی بات نہ ہو سکی۔

کیا یہ سب باتیں ہی باتیں تھیں، زبانی نعرے تھے۔ کوئی بھی اس بارے میں سنجیدہ نہ تھا یا واقعی یہ منزل ناقابلِ حصول سمجھ کر اس کی طرف گامزن ہونے کی کوششیں چھوڑ دی گئیں؟

پاکستان کا معاشی، معاشرتی اور سیاسی ڈھانچہ کیا ہوگا؟ کیا اس بارے میں آپ کے ذہن میں کوئی واضح نقشہ تھا جس وقت آپ اس کے لئے جد وجہد کر رہے تھے؟ اس موضوع پر پاکستان ٹیلیویژن نے ایک بار بڑے بڑے نامی گرامی رہنماؤں کو اظہارِ خیال کی دعوت دی تھی ۔۔۔ جن لوگوں نے یہ پروگرام دیکھے وہ گواہ ہوں گے اس بات کے کہ ان میں سے کسی کے ذہن میں بھی کوئی واضح نقشہ نہ تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی قائدِ اعظمؒ کے اس قول کی طرف اشارہ تک نہ کیا جس میں آپ نے پاکستانی معاشرے اور حکومت کی خصوصیتیں بیان کی تھی۔

> اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمنٹ کی نہ کسی شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی حکومت قرآنی اصول واحکام کی حکمرانی کا نام ہے

کیا وہ سب اس سے بے خبر تھے؟ یا کسی سیاسی مصلحت نے ان کی زبان پکڑ لی اور وہ برملا اس کے اظہار کی جرأت نہ کر سکے۔

اسلام، اسلامی نظام، اسلامی حکومت کے متعلق جب بھی کوئی بات ہو مشکل یہ ہے کہ ایک خاص طبقہ درمیان میں آن ٹپکتا ہے، وہ طبقہ خود کو اسلام کا اجارہ دار سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسلام کے متعلق کچھ پوچھنا ہو تو ہم سے پوچھو۔ ہم سے بہتر اس بارے میں کون رائے دے سکتا ہے۔

بلکہ اس دور میں تو اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر وہ طبقہ یہ کہتا ہے کہ تم ایک طرف ہو جاؤ۔ اقتدار ہمارے حوالے کر دو۔ ہم اسلام نافذ کریں گے کیونکہ ہم ہی اس کو سمجھتے ہیں۔ ہم مفتیانِ شرعِ دینِ متین ہیں۔ ہم علمائے کرام ہیں ۔۔۔ وہ طبقہ یہ ماننے کے لئے تیار ہی نہیں کہ ان کے سوا اور بھی کوئی اسلام کو سمجھ سکتا ہے۔

انہوں نے اسلامی تعلیمات کو بھی وہ گیپت دویا بنا رکھا ہے جو صرف ان پنڈتوں کو سمجھ آسکتی ہے۔

ان کی باتوں کا برسر اقتدار طبقے کے پاس کوئی جواب نہیں۔ ان کی اپنی کمزوریاں انہیں اس طبقے کے پراپیگنڈے کا ہدف بنائے رکھتی ہیں اور وہ ان کے مقابلے میں ہمیشہ ڈیفنس پر ہوتا ہے اور وہ اپنے اقتدار کی خاطر اپنے سیاسی بیانوں اور پبلک بیانات میں اس طبقے کے متعلق باادب اور پر عقیدت ہوتا ہے۔

آپ خوب واقف ہیں کہ اقتدار کیسی جاذب نظر ہی نہیں، دل موہ لینے والی چیز ہے۔ کون مجنوں صفت اس لیلیٰ کا خیال چھوڑ سکتا ہے؟ آج کل کی جمہوریت کے نام نہاد الیکشنوں کے بل پہ آئے ہوئے پارٹی ڈسپلن کے پابند اور اس سے بھی زیادہ اپنے اپنے مفاد اور اپنی اپنی خواہشات کے غلام کب برداشت کر سکتے ہیں۔ کہ اقتدار چھوڑ دیں — وہ ان کی خوشامد کرتے ہیں، مسکہ لگاتے ہیں اور پھر انہیں حصہ دار بنانے کا لالچ دیتے ہیں اور یہ طبقہ ان مفاد پرستوں کا آلہ کار بن کر عوام کے لئے عذاب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

ان دو طبقوں کی ملی بھگت سے عوام پستے رہے، دنیاوی معاملات کے متعلق قوانین برسر اقتدار طبقہ بناتا رہے ٹیکس لگائے، جرم، فرد جرم عاید کرتا رہے انصاف سے مذاق کرتا رہے اور شادی بیاہ، نکاح، حق مہر، طلاق، تجہیز و تکفین، ختم اور چالیسویں کی رسمیں ان حضرات کے سپرد۔ اگر کوئی حکومت ان معاملات میں دخل دے تو ایک طوفان اٹھ جاتا رہا۔ آپ بتائیے کہ اس ملک کی بے شمار جمعیت ہائے علمائے اسلام (پہلے مجھے کوئی یہ تو سمجھا دے کہ جب سب کے پیش نظر اسلام ہی کا نفاذ ہے تو اتنی زیادہ جمعیتوں کے قیام میں کیا تک ہے۔ کیا ان سب کے اسلام الگ الگ ہیں؟) اسلامی جماعتوں، علماء پارٹیوں، علماء بورڈوں اور ایسی دوسری جماعتوں نے کبھی مزدوروں کے حقوق کے لئے آواز اٹھائی، کسانوں کے بے دخل کئے جانے پر کوئی بیان دیا۔ انصاف کے حصول کے طریق کار کو سہل بنانے کے لئے کوئی تحریک تو کیا، ایک ریزولیوشن تک بھی پاس کیا۔ کبھی انہوں نے سماجی برائیوں کے خاتمے یا سمگلنگ، بلیک مارکیٹ، ملاوٹ، رشوت کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کرنے کے لئے منبر سے آواز بلند کی۔ ایسے عناصر کے خلاف کوئی فتوے دیا۔ کبھی اعلان کیا کہ وہ کسی بلیک مارکیٹر، سمگلر یا راشی افسر کا جنازہ نہ پڑھائینگے۔ مسلمانوں کے قبرستان میں جگہ نہ دیں گے۔ ان کے بچوں کے نکاح نہ پڑھائینگے — لیکن آپ نے دیکھا یہی علماء کرام آتش زیر پا ہو گئے، جیسے پاؤں کی بلی کی طرح چیخنے کو دینے لگے جب ایوب حکومت نے عائلی قوانین پاس کئے —!

پہلی بار کسی حکومت نے شخصی معاملات کے متعلق کچھ قوانین بنائے جو روح اسلام سے قریب تر تھے۔ پہلی بار کسی حکومت نے پبلک لاز (PUBLIC LAWS) اور پرسنل لاز (PERSONAL LAWS) کی ثنویت پر ایک ضرب لگائی۔ ان علماء حضرات نے آج تک اس کی یہ خطا نہیں بخشی۔ اس کے خلاف دبان بند نہیں کی کسی اور کو تو ایوب خان کے متعلق اور ستم کی شکایات ہوں گی، ان حضرات کو انہی قوانین کا دکھ ہے ان کی فرد جرم میں سرفہرست ایوب کی یہی خطا ہے۔ یہی عائلی قوانین جن کے ذریعے اس نے ان کے خلائی اختیارات میں دخل دیا۔

اور خود ان حضرات سے کبھی اسلامی نظام کے متعلق پوچھئے تو اس کا جواب ان کے پاس یہی ہوتا ہے چند عبادات کی ادائیگی، رسومات کی پابندی، خاص وضع قطع کا لباس اور ظاہری شخصیت۔ جمعہ کی چھٹی، چار شادیوں اور لاتعداد لونڈیوں کی کھلی اجازت یا کچھ تعزیرات، چور کے ہاتھ کاٹ دیں۔ زانی کو سنگسار کر دیں سود کی بات کریں گے مگر سود کیا ہے اس کے متعلق ابھی تک خود ان کے ذہنوں میں التباس ہے۔

تو کیا جس معاشرے میں یہ تعزیرات رائج ہو جائیں وہ اسلامی ہو جائے گا۔ اگر امریکہ یہ سزائیں اپنے ہاں رائج کر دے یا روس میں یہ سزائیں رائج ہو جائیں تو یہ ممالک اسلامی کہلانے کے حقدار ہو جائینگے۔

اور پھر مجھے یہ بھی بتایئے کہ اگر ایک شخص ساری عمر چوری نہیں کرتا، ساری عمر کوئی قانون نہیں توڑتا (یا ساری عمر قانون سے بچا رہتا ہے) اس کے لئے ان سزاؤں والے ملک اور دوسرے ملک میں رہنے سے کیا فرق ہوگا۔ ایسی سزاؤں والے ملک میں رہنا جرم پسند طبیعت کے لئے تو صعوبت کا باعث ہو سکتا ہے مگر امن پسند کو اس میں کیا ملے گا۔ ایک غیر اسلامی معاشرے والے ملک اور ان کے تصور کے اسلامی ملک میں رہنے والے ایک امن پسند شہری کی زندگی میں کیا فرق ہوگا؟ اسلامی ملک کا اقتصادی ڈھانچہ کیا ہوگا؟ اس کے متعلق ان مختلف جمعیت ہائے علمائے اسلام نے کبھی کوئی واضح نقشہ دیا؟ کیا اس میں یہی ہوگا کہ ایک طرف بڑے بڑے امیر، نواب اور شیخ ہوں گے جو وسیع اراضی، املاک اور محلات کے مالک ہوں گے جن کے اپنے کاروں کے قافلے ہی نہیں بلکہ نجی ہوائی اور سمندری جہاز ہوں گے اور دوسری طرف نان شبینہ کے محتاج بھکاریوں کے ہجوم جن کے پاس نہ تن ڈھانپنے کو کپڑا ہو نہ سر چھپانے کو مکان اور نہ ہی علاج معالجہ کا کوئی وسیلہ۔ اگر ان کی اسلامی مملکت جنت کا نمونہ ہوتی ہے تو مجھے بتائیں ان کی جنت میں جہنمیوں کے یہ غول کے غول کہاں سے گھس آتے ہیں۔ نہ جنت کا کوئی گوشہ جہنم ہو سکتا ہے اور نہ جہنم کا کوئی گوشہ جنت۔

یہی وجہ تھی کہ اسلام کے نام پہ حاصل کئے گئے اس ملک میں نیا نعرہ گونجا۔ روٹی۔ کپڑا۔ اور مکان تو محروم لوگ سب اس طرف دوڑے اور سوشلزم کا نعرہ دینے والوں نے کہا۔ اسلامی نظام اگر جنت ہے جنت میں نہ کسی کو بھوک کا خوف ستاتا ہے اور نہ گرمی سردی اور نہ کسی قسم کا خوف اور حزن۔ ہم بھی یہی وعدہ لے کر آئے ہیں۔ ہم خلاف اسلام نہیں۔

صدیوں سے سرمایہ داری نظام کے ستائے ہوئے اس ظلم کی آگ میں جلتے ہوئے جسموں کو ٹھنڈی ہوا کا جھونکا دور درختوں کی شاخوں میں سرسراتا ہوا محسوس ہوا، محرومی کے شکار لوگوں کی آنکھوں میں ایک نئی چمک پیدا ہوئی۔ مخالفین نے اس کے خلاف کفر کے فتوے دیئے۔ اس کا راستہ روکنے کے ہزار جتن کئے۔ مگر مخالفت کرنے والے اس سیلاب کے آگے بند نہ باندھ سکے۔ اور خود خس و خاشاک کی مانند بہہ گئے۔ لوگوں کے رد عمل نے ثابت کر دیا کہ تن کی ضرورتیں زیادہ بنیادی۔ زیادہ ضروری اور زیادہ سچی اور حقیقی (REAL) ہوتی ہیں اور ان کو پورا کئے بغیر نہ کسی فلسفے پہ گفتگو ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی اور نظری بحث۔

کفر کے فتوے کسی مسلمان کو روٹی، کپڑے اور مکان کے حق میں ووٹ ڈالنے سے نہ روک سکے۔ وہی مسلمان جو مسلمان رہ سکنے کی امید میں اپنے آبائی شہروں، بھرے پُرے مکانوں، کھیتوں، کھلیانوں، بچپن اور جوانی کی یادوں کے مسکنوں کو چھوڑ آئے تھے، ان چوبیس سالوں میں ان کا یہ حال ہو گیا کہ کفر کے فتوے ان کی راہ نہ روک سکے؟ ایسا کیوں ہوا؟ اس پر بھی کبھی کسی نے غور کیا! وہ مسلمان جو اپنا سب کچھ لٹا کر خالی ہاتھ ادھر پہنچ پائے تھے، اپنے خوابوں کی جنت کی طرف ہجرت کر کے آئے تھے اور آپ نے اسے سرمایہ داری کی بدترین شکل والے جہنم میں دھکیل دیا۔ اور وہ اس حقیقت کو ڈراؤنا خواب سمجھ کر چیخ اٹھا۔ وہ جاگ اٹھا۔ اب اسے سلانے کی کوشش کرنا بیکار تھی۔ وہ آنکھیں بند نہیں کرنا چاہتا، مبادا وہی ڈراؤنا خواب اسے پھر گھیر لے۔ اسے علم تھا کہ اسلام کا نام لے کر ووٹ کی بھیک مانگنے والوں نے کبھی ظلم و ناانصافی کے ہاتھوں مجبور انسانوں کے حقوق کے لئے آواز نہیں اٹھائی۔ انہوں نے تقدیر پر شاکر رہ کر ظلم سہنے کا فلسفہ تو ان کو بارہا سنایا، کبھی ظلم کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے حقوق منوانے کی راہ نہیں سمجھائی۔ انہیں معلوم تھا کہ مُلّا کے اسلام کے خلاف ووٹ دے کر وہ دین خداوندی سے انحراف کا مرتکب نہیں ہو رہا تھا، وہ سوشلزم کو ووٹ دے کر محض اپنی اقتصادی حالت بدلنے کا خواہش مند تھا، اس سے زیادہ کسی بات کا نہیں۔ چنانچہ انہوں نے سماجی انصاف اور مساوات کی علمبردار جماعت کو ووٹ دے کر کامیاب بنایا جو غربت دور کرنے بے گھروں کو آباد کرنے، بے روزگاروں کو روزگار دلانے کا پیغام لے کر ابھری تھی۔ اس کی کامیابی کوئی معمولی بات نہ تھی۔ خاص طور پر جب یہ ذہن میں رکھا جائے کہ اس خطۂ زمین میں نسل در نسل خاندانی سیاست چل رہی تھی۔ وہی زمیندار، وہی وڈیرے، وہی سرمایہ دار، چند خاندان تھے جو بھیس بدل بدل کر حکومت کی کرسیوں پر براجمان چلے آ رہے تھے۔ کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ان کا راج سنگھاسن بھی ڈول سکتا ہے۔ مگر جب محروم لوگوں میں محرومیت کا احساس بیدار کر دیا جائے تو وہ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ان کا یوں یکبارگی اٹھنا پرانے نظاموں کے لئے قیامت کی گھڑی ہوتا ہے۔

دوسری طرف ہم نے دیکھا کہ زبان، نسل، جغرافیے کے جن بتوں کو ہم توڑ آئے تھے کسی سامری کے جادو کے تحت ان کی محبت پھر سے ہمارے دلوں میں جاگزیں ہو گئی۔ مشرقی پاکستانی بھائی پھر بنگالی قومیت کے بچھڑے کو پوجنے پر مُصِر تھے۔ ہم نے انہیں لاکھ یاد دلایا کہ ہم ان کے مسلمان بھائی ہیں، ہم اسی خدا کو مانتے ہیں اسی پیغمبر کی نام لیوا اُمت ہیں، ہم ایک ہی کتاب کو مانتے ہیں۔ مگر انہوں نے کہا، اپنا منہ سنبھالو۔ اس میں سے ہمارے خون کی بُو آتی ہے۔ تمہارے لبوں کے کناروں سے ہمارا لہو ٹپک رہا ہے۔ تم ہمارے بھائی کہاں۔ ان کے رہنما پکار اُٹھے۔ الفراق۔ الفراق۔ سلام علیکم۔

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی
بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر ہووے

اور یوسف سا یہ بھائی جو اپنے سنہری ریشے، سندربن، چائے کے باغات، کرنافلی کے کارخانے کی دولت کے باوجود اپنی غربت سے دکھی تھا، اپنی بھر سوت کے عوض اغیار کے ہاتھوں بک گیا۔

اور ہمارے انہی بھائیوں نے جو اسی اسلام کا دم بھرتے تھے، اسی پیغمبرؐ کا نام لیتے تھے، اسی کعبے کی سمت نماز پڑھتے تھے، ہندو کے ساتھ مل کر اپنے بھائیوں، بہنوں، بچوں اور بوڑھوں کے ساتھ وہ سلوک کیا کہ اسلام تو کیا کسی بھی مذہب، مذہب بھی نہیں کسی بھی مہذب سوسائٹی کا منہ کالا کر دینے کو کافی ہے۔

غیروں کی مدد سے وہ اپنوں سے "آزاد" ہو گئے۔ جیتے جاگتے انسانوں کے جسموں میں سرعام سنگینیں پار کر کے بہنوں کو سرحد کے پار رسوا سربازار کر کے، خوشی کا وہ وحشی ناچ ناچا گیا کہ شاید تاریک افریقہ کے تاریک تر جنگلوں میں رہنے والے وحشی بھی دیکھیں تو شرما جائیں۔ اور نام ان کے اب بھی عبدالصمد۔ ظل الرحمان محمد طفیل مجیب الرحمٰن۔ عبدالرحمٰن اور نسبت صدیقی۔

ان کے اسلام نے ان کا ہاتھ کیوں نہیں روکا۔ یہ بھی سوچ کا مقام ہے۔ کسی مسلم لیگی نے جو قیام پاکستان کی جدوجہد میں ان کے شانہ بشانہ لڑا تھا اور جس سال یہ راگ الاپتا رہا کہ یہ ملک اسلام کے نام پہ حاصل کیا گیا ہے، اسلام کے مضبوط رشتے نے ہمیں ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا ہے۔ یہ نہیں سمجھایا کہ ایسا کیوں ہوا؟ کیا عبدالصمد آزاد نے طفیل محمد نے یا صدیقی نے، کیا مجیب الرحمٰن نے جن کے یکم سے پچیس مارچ ۱۹۷۱ء کے کامل اقتدار کے دوران ایسے بہیمانہ مظالم ہوئے کہ ۷۱ء کے نقشے میں وحشت سکھ بھی شرما جائیں۔ اسلام سے برگشتگی کا، اس سے برأت کا اعلان کیا۔

قرآن ایک مسلمان کو عمداً قتل کرنے والے کو ہمیشہ کے لئے جہنم کی سزا دیتا ہے اور یہاں مشرقی پاکستان تو ایک طرف مغربی پاکستان کے کسی مفتی نے ان لوگوں کے اسلام کے دائرے سے خارج ہونے کا فتویٰ دیا؟ نہیں اور یقیناً نہیں ۔۔۔!

تو کیا ہم سمجھ لیں کہ واقعی مذہب کا رشتہ قومیت کا معیار نہیں ہو سکتا اور معیار قومیت زبان، نسل، لباس اور کلچر نامی چیزیں ہوتی ہیں۔

ہمارے بزرجمہروں نے اس کو بزعم خود جھٹلانے کے لئے کبھی یہ کہا کہ ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن میں ہی دو مسلمان مملکتیں مقصود تھیں اور کبھی کہا کہ دو کی بجائے تین قوموں کے وجود میں آنے سے دو قومی نظریہ باطل نہیں ہوا۔ تیسری نیشن کن اصولوں اور کن بنیادوں پہ معرضِ وجود میں آئی۔ اس سے انہیں کوئی غرض نہیں۔ اور انہی بنیادوں کو اصول سمجھ کر بات ذرا پھیلا دی جائے تو زد کہاں کہاں پڑے گی۔ اس سے بھی انہیں کوئی غرض نہیں ۔۔ ایک طرف علیحدگی اور دوسری طرف یہ بدمزگی ۔۔ اس سب کو دیکھتے ہوئے آج پھر کوئی نوحہ کناں ہے۔

وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں!
وہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں۔

اب پھر ہر کوئی سوچ رہا ہے کہ ہم سے غلطی کہاں ہوئی ہے۔ الیکشن جمہوری اصولوں کے عین مطابق ہوئے تھے۔ جمہوریت ہی تو سب جماعتوں کی منزل مقصود تھی اور جب جمہوریت بھی آ گئی تو پھر رونا کس بات کا۔ اب پھر ہر کوئی مایوس نظر آتا ہے اور کوئی بھی اس سے نکلنے کی راہ بتانے والا نظر نہیں آتا۔

دامِ ہمرنگِ زمین کی نشان دہی کی تو صرف فکرِ طلوعِ اسلام نے۔ اس نے بتایا کہ ہر طریق اقتصادیات کسیطرح ہر سیاسی طریق کے پیچھے ایک فلسفہ کارفرما ہوتا ہے اور یہ اس فلسفے سے کٹ کر کوئی معنی نہیں رکھتے۔ سوشلزم کی طرح مغربی طرز کی جمہوریت کا فلسفہ بھی وحی، پیغمبر، اور دین سے یکسر بیگانہ ہے۔ اسلام وہ واحد دین ہے جو ہر شخص کو اس کا مقام دیتا ہے۔ اس کا نظام صرف رزق ہی نہیں رزق باشرف، رزق کریم دیتا ہے۔ وہ زندگی کے تسلسل کا قائل ہے اور اس دنیا میں سرفرازیاں اور دوسری دنیا میں سرخروئی دونوں کی بشارت دیتا ہے۔ سوشلزم دوسری دنیا کا، حیات بعد الممات کا قائل نہیں اور اس دنیا میں خوشحالی کے لئے کسی اخلاقی قید کا پابند نہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو اخلاقی حدود کا پابند کئے بغیر صرف اس دنیا میں کسی بھی طریق سے خوشحالی حاصل کر لینے کا مژدہ سناتے ہیں وہ ایسے ہی اقتصادی پروگراموں کا نام لیتے ہیں اور اخلاقی حدود کی پابندی ہے بھی بڑے دل گردے کا کام۔ خاص طور پر جب آپ کو ٹوکنے والا بھی کوئی نہ ہو۔ قانون کا ہاتھ آپ کے گریبان تک پہنچ ہی نہ سکتا ہو۔

کچھ لوگ شاید خوشحالی کی اس راہ کو شارٹ کٹ سمجھتے ہیں۔ اقتصادی مسائل کے حل کئے بغیر محض جذباتی طور پر مذہبی نعرے اور محض اقتصادی مسائل پر زور، دونوں کا نتیجہ سامنے ہے۔ افیونِ منون ببعض اور تکفرون ببعض سے کام نہیں چل سکتا۔ دوسرے نظاموں کی طرح اسلامی نظام کو اس کے فلسفے کے بغیر نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ آخرت کو مانے بغیر اس دنیا میں اپنے ہنر سے کمائے ہوئے کو از خود دوسروں کے فائدے کیلئے دے دینا ممکن نہیں۔ مفاد خویش کا جذبہ بار بار پکارتا ہے کہ صاحب جب جائیداد نہیں بنا سکیں گے، روپے کو اپنی سہولتوں بلکہ عیاشیوں کے لئے خرچ نہ کر سکیں تو اس کا فائدہ کیا، کمائیں ہی کیوں؟ اس کیوں کا جواب سوشلزم والوں کے پاس نہیں۔ خود محنت کر کے کمائیں اور یہ کمائی دوسروں کو دینا اتنا بڑا انقلابی کام ہے کہ آخرت کے فلسفے پر ایمان کے بغیر کسی کے بس کی بات نہیں۔ انقلابی کہلانے والے انقلاب کے نام پر ہر بے راہ روی کو اپنے لئے روا سمجھنے کا حق رکھتے ہیں۔ نفس کی ہر خواہش کو اپنا الٰہ بنا لیتے ہیں مگر اس انقلاب کے لئے تو بنیاں خانۂ دل میں چھپے ہوئے اپنے مقدس معتقدات کو بھی چھوڑنا پڑتا ہے۔ زبان، نسل، رنگ نام نہاد کلچر کی بنا پر تو ہر آدمی خود بخود کسی نہ کسی قوم کا فرد بن جاتا ہے۔ اس کی پیدائش ہی اس بات کا فیصلہ کر دیتی ہے کہ وہ کس قوم کا فرد ہے لیکن دین کی بنا پر تو سوچ سمجھ کر دل و دماغ کے فیصلے اور ارادے سے انسانوں کے ہم خیال گروہ سے مل کر قوم بننا پڑتا ہے۔ اس کے لئے پہلے انسانوں کا ایک نظامِ زندگی ۔ دین ۔ پر ایمان ہونا ضروری ہے۔ مشرقی جرمنی اور مغربی جرمنی، دونوں میں ایک ہی نسل، ایک ہی رنگ، ایک ہی زبان بولنے والے، ایک ہی طرح کا لباس اور کلچر رکھنے والے لوگ بستے ہیں مگر اپنا اپنا ملک الگ الگ رکھنے پر مصر ہیں، کیوں؟ اس لئے کہ ان کا "دین" الگ ہے۔

ہم نے اس ملک میں اسلام کا نام تو بہت استعمال کیا۔ لیکن اسلام کو بطور ایک دین ایک نظامِ زندگی نافذ کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ اسے اپنی زندگیوں کا، اپنی سوچوں کا منبع بنانے کی

کوشش نہیں کی۔ جو لوگ برسرِ اقتدار رہے انہوں نے اسے سیاسی سٹنٹ بنائے رکھا اور جب کبھی اسے نافذ کرنے کا خیال کیا، مذہب کے اجارہ داروں کا یہ طبقہ آڑے آیا بلکہ رستے میں حائل ہو گیا۔ یوں یہ خدا پرست، مذہب کے ٹھیکیدار خدا کی راہ میں روک — یصدّون عن سبیل اللّٰہ — بنے رہے۔ الیکشن کے دنوں میں پی۔ پی کے ایک مولانا نے کہا تھا کہ جو مولوی لوگ رعب دے رہے ہیں کہ نکاح کس سے پڑھواؤ گے، جنازے کون پڑھائے گا — تو یہ کونسا ایسا مشکل کام ہے، ہم یہ کام نوجوانوں کو بآسانی پڑھا دیں گے۔ اور ان کی محتاجی نہ رہے گی۔ مگر حکومت بنانے کے بعد شاید یہ آسان کام مشکل ہو گیا۔ مگر ہیں آج بھی حکومت سے یہ کہوں گا کہ ہمیں ان فرسودہ قسم کے لوگوں کی ضرورت نہیں جو یا تو استحصال کرنا جانتے ہیں یا آلۂ کار بننا۔ ملک میں جہاں سائنس کی تعلیم عام ہو وہاں (HUMANITIES) فلسفہ اور مذہبیات کے ایم۔اے ایسے ہوں جنہیں ہم فرسٹ کلاس گزیٹیڈ پوسٹ دے کر مساجد میں امام اور مساجد سے ملحقہ لائبریری، ریڈنگ روم، کمیونٹی ہال اور پلے گراؤنڈ کا انچارج بنائیں اور نجی دارالعلوموں کے فارغ التحصیل لوگوں کی اجارہ داری ختم کی جائے۔ یہ پوسٹیں ٹرانسفر ایبل ہوں۔ کوئی مسجد کسی فرقے سے مخصوص نہ ہو۔ مذہب کو ان لوگوں کے چنگل سے نکالنے کے لئے روشن دماغ، تعلیم یافتہ لوگوں پر مشتمل مذہبی امور کی وزارت مرکز میں ہونی چاہیئے۔ یہ سدِ راہ ہٹ جائے تو راستہ صاف ہو جائے گا۔ ہر مسلمان کا راہنما خدا کی کتاب ہے۔ ہر مسلمان کے لئے لازم ہے کہ وہ اسے خود سمجھنے کی استعداد اپنے اندر پیدا کرے۔ زندگی میں کوئی مسئلہ درپیش ہو، قرآنی تعلیمات کی رہنمائی سامنے ہونی چاہیئے۔ زندگی کا کوئی گوشہ اس کے احاطہ سے باہر نہیں۔

ہم ایک عرصہ سے پکارتے چلے آ رہے ہیں کہ ہمارے دین میں سبھی مشکلات کا حل موجود ہے۔ یہ ہر شعبۂ زندگی کے متعلق راہنمائی دیتا ہے۔ یہ ہمیشہ کے لئے۔ زمانہ لاکھ بدل جائے اس کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ یہ خدائے علیم و خبیر، حی و قیوم کا کلام ہے۔ مایوسی کے ہر دور میں ہمیں اس اسٹیج سے یہی پیغام ملا۔ نہ ہو مایوس — مایوسی ابلیسیت ہے۔ مایوسی تاریکی ہے۔ مایوسی موت ہے۔ دین امید کا نام ہے۔ دین روشنی ہے۔ دین زندگی ہے۔ بازآفرینی کے دروازے ہمیشہ کھلے ہیں۔ مردہ قومیں اس پیغام پر عمل پیرا ہو کر حیاتِ نو حاصل کر سکتی ہیں۔

مگر ہم آج کس مقام پر ہیں، ہماری آواز پہلے کبھی نقار خانے میں طوطی کی آواز تھی اور آج بھی صحراؤں میں گونجتی ہوئی بے نام راہی کی صدا ہے آپ اس میں امید کا یہ پہلو ڈھونڈ لیں کہ جو لوگ چند سال قبل اس آواز کو سننا کبھی گوارا نہ کرتے تھے آج اس پر غور کرتے ہیں۔ مخالفوں کے بیانات، ان کی تحریریں میں زبان ہماری ہوتی ہے۔ DICTION ہمیں سے مستعار ہوتی ہے۔ ہم خوش ہیں کہ

یہاں تک تو پہنچے، یہاں تک تو آئے۔

مگر ہم نہیں دیکھتے کہ زمانہ کس تیز رفتاری سے آگے جا رہا ہے۔ اس حلقے کے لوگوں کی تعداد کا عالم آج بھی وہی اور ان کے ذرائع — طلوع اسلام کالج کا خواب ابھی خواب ہے۔ ایک کنونشن کا انتظام

اور ایک رسالے کی اشاعت بھی اس کے لئے ایک مسئلہ رہتا ہے۔ آپ کہیں گے یہ ایک فکری تحریک ہے۔ پڑھے لکھوں کی تعداد کم ہے اور یہ لکھے ہوئے پیغام سے بڑھنے والی تحریک ہے۔ آپ پیغمبروں کی تحریکوں کی مثالیں دینگے مگر آج دنیا بہت چھوٹی ہو چکی ہے۔ ہزاروں میل دور ہونے والی تبدیلیوں کی بازگشت دنیا کے مختلف ملکوں میں سُنی جاسکتی ہے۔ چھوٹے ملکوں کو تو آج اپنی مرضی کی حکومت اور مرضی کے حکمران چننے کی بھی اجازت نہیں۔ لیاقت اور لومبا اُس کی شہادت دیں گے۔ شاید یہ بھی ایک وجہ ہے کہ اب پیغمبر نہیں آتے۔ سیاسی تحریکیں اٹھتی ہیں۔

اس فکر کو آگے بڑھانے کا ایک طریقہ طلوع اسلام کالج سوچا گیا تھا جہاں طالب علم شروع ہی سے اسلامی اور قرآنی ذہن لے کر زندگی کے میدان میں آگے بڑھیں اور جہاں جہاں بھی وہ جائیں قرآنی شمع کی روشنی ان کے آگے آگے تاریکی دور کرتی جائے۔ تربیت کے لئے تازہ ذہن چننے کے لئے طریقہ وہی ہے جو بنی اسرائیل کی پرانی نسل کا اس حد تک تعاون آمادہ نہ پاکر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا اور تمام تر توجہ نئی نسل کی تربیت پر مرکوز کر دی تھی۔ یہی تربیت یافتہ جوان نسل تھی جو بالآخر فرعونیت اور ملوکیت کے زوال کا باعث بنی۔ خالی درس سن کر چلے جانے سے یہ بات نہیں چل سکتی۔ درس سننے والے ملک میں زیادہ نہیں تو ہزاروں آدمی تو ایسے ہیں جو اتوار کی اتوار التزاماً اس میں شامل ہوتے ہیں۔ سنتے ہیں اور چلے جاتے ہیں اور اگلی اتوار تک اُسے بھول جاتے ہیں۔ فکر آگے بڑھے تو کیونکر۔ جو اس فکر کو درست سمجھتا ہے اس کا ایک فریضہ اُسے آگے پہنچانا بھی تو ہے۔ بلّغ ما انزل الیک ۔ یہ کیسے ہو۔ درس سننے والے میرے ساتھی دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ ہم نے اسے زندگی کا مشن کس حد تک سمجھا ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو درس کے بعد اس طریقے سے قرآن کو خود پڑھتے ہیں اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنہیں زندگی کے مختلف موضوعات کے متعلق قرآن سے حوالے یاد ہیں۔ یا حوالہ ڈھونڈ سکتے ہیں۔

خود طلوع اسلام کا لٹریچر ہم نے کس حد تک پڑھا اور سمجھا ہے۔ عربی زبان سیکھنے کی کیا کوشش کی ہے۔ عربی سیکھے بغیر ہم قرآن پاک کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

اگر ہم مناسب علم سے لیس ہوں تو پھر ہم ہر سٹیج پہ یہ پیغام لے کر جا سکتے ہیں۔ مقاماتِ آہ و فغاں کی کمی نہیں۔ ادبی انجمنیں ہیں۔ سماجی انجمنیں ہیں۔ نیشنل سنٹرز ہیں۔ دانشوروں کے فورم ہیں۔ یہی نہیں خود سیاسی پارٹیوں میں اس فکر کے حامل اپنا اپنا دائرہ وسیع کرتے جائیں۔ سیاست زندگی کا ایک بڑا اہم حصہ ہے۔ اس سے بالکل بیگانہ ہو کر آپ زندگی نہیں گزار سکتے۔ (سیاست میں حصہ لینے سے مراد یہی نہیں ہے کہ آپ جلسے جلوسوں میں شرکت کریں۔ سڑکوں پر نعرے لگائیں) سیاست میں حصہ لینے والوں کی سوچ کو اپنے نقطہ نظر کے مطابق ڈھالنے کی کوشش بھی تو سیاسی معاملہ ہے۔ سیاسی تربیت کا پہلا مرحلہ گھر ہے۔ سورۃ یونس میں جو ہر گھر کو قبلہ بنانے کا ذکر ہے تو اس سے مراد یہی گھر کو نظریاتی تربیت گاہ بنانا ہی تو ہے۔ یہ کام خاندان کا بزرگ بہتر سرانجام دے سکتا ہے۔ اور یہ تبھی ممکن ہے جب وہ خود اس پر پختہ یقین رکھتا ہے بلکہ اس پر عمل پیرا بھی ہو ۔۔۔۔ خوش قسمتی سے ابھی تک سربراہ خاندان کا رتبہ اکثر گھروں میں ایسا ہے کہ پورے خاندان

کی سوجھ کا رُخ بدل سکتا ہے۔ بڑی عمر میں پڑھنا کوئی عیب کی بات نہیں۔ میں ادارے سے اپیل کروں گا کہ عربی کی تعلیم و تدریس کے لئے کوشش کرے۔ اس سلسلے میں اگر حکومت کی یا کسی مسلمان ملک کے سفارت خانے کی مدد لینی پڑے تو گھبرانے کی بات نہیں۔ بزرگ خود پڑھیں اور دوسروں کو پڑھائیں — اور یوں ہر گھر قبلہ بن جائے۔ اور ان گھروں سے نکلے ہوئے بچے جہاں بھی جائیں اس پیغام کی شمعیں بن کر اندھیرے ماحول میں اجالا کرتے پھریں۔ پھر ہماری منزل دور نہیں ہوگی۔ کیونکہ پھر کا ئناتی پیمانوں کی بجائے انسانی پیمانوں سے وقت کو ناپا جائے گا۔ ہمارا یہ ایمان تو ہے کہ اسلام غالب آکر رہے گا مگر کس کے ہاتھوں۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے — اور — اور یہ میں بڑے دُکھ سے کہہ رہا ہوں کہ اگر پھر بھی محسوس ہو کہ یہ پیغام جڑ نہیں پکڑ رہا، بڑھ پھیل نہیں رہا تو پھر ہمیں سوچنا ہوگا کہ ہم سے کیا کوتاہی ہو رہی ہے۔ یا پھر یہ کہ اگر یہ زمین اس کے لئے موزوں نہیں تو پھر کون سی سرزمین اس کے لئے موزوں ہوگی اور وہاں یہ پیغام کیسے پہنچایا جائے۔ کیونکہ یہ پیغام زمان و مکان کا مقیدی نہیں۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں محتاج
بہار ہو کہ خزاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

ایک اور نشانی مٹ گئی

پرچہ مرتب ہو چکا تھا کہ ڈیرہ اسمٰعیل خان کے محترم مطیع اللہ خان خاکزئی کے خط سے یہ روح فرسا خبر ملی کہ رفیقِ مکرم حاجی نظام بخش خان، ۴ اور ۵ جنوری کی درمیانی شب عالمِ جاودانی کو سدھار گئے۔ خان صاحب مرحوم قرآنی فکر کے قدیم ترین شیدائیوں میں سے تھے۔ اپنے رفیقِ شفیق، محترم یار محمد خان صاحب کے ہمراہ، بالالتزام طلوعِ اسلام کنونشن میں شریک ہوتے اور ضعیف العمری کے باوجود سفر کی صعوبات ان کے راستے میں کبھی حائل نہ ہوتیں۔ نہایت سنجیدہ فکر اور شگفتہ مزاج مخلص دوست تھے۔ حلقۂ طلوعِ اسلام میں ان کی وفات کی خبر بڑے صدمہ کے ساتھ سنی جائے گی۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے سحابِ کرم کے سایہ سے نوازے، اور ان کے متعلقین اور رفیقِ قدیم، یار محمد خان صاحب کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

شریکِ اندوہ
ادارۂ طلوعِ اسلام

طلوعِ اسلام کنونشن کا مقالہ

چوہدری عطاء اللہ (ایڈووکیٹ)

نہ ہو نومید نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے

صدرِ محترم، خواتین و حضرات! مصرعۂ عنوانِ تحریر کا خالق اقبال کہ پیغامبرِ صبحِ امید ہے، یاس و قنوطیت کو عجز اورِ اکِ حقیقت اور ضعفِ خودی کے امراض کی علّت گردانتے ہوئے اژدہامِ حوادث اور ہجومِ آلام کے تاریک سایوں میں بھی اُمید کے چراغ جلائے رکھنے کا آرزومند ہے۔ اسی اُمید کا دوسرا نام ایمان ہے۔ اور ایمان ہی وہ مہمیز ہے جو سفرِ زندگی میں اشہبِ خیال اور راہوارِ عمل کو سوئے منزل گامزن رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو جنسِ ایمان ایک حرفِ بے معنی ہے کہ کارزارِ حیات میں جس کی کچھ بھی قدر و قیمت نہ ہے۔

اقبال قرآن کے وسیلے سے اقوامِ عالم کو خطاب کرتا ہے۔ تاہم اُس کی اولین مخاطب ملتِ اسلامیہ اور بالخصوص مسلمانانِ برِعظیم ہیں۔ مفکرِ پاکستان ہم سے ہمکلام ہوتا ہے تو ذکر و بیانِ حال کے وقت ہمارے ماضی و مستقبل کو بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ غم و دوش سے نڈھال قوم کو فکرِ فردا کا احساس دلاتے ہوئے تابناک ماضی کو اس انداز سے سامنے لاتا ہے کہ ماضی کی ضوفشانیوں میں فردا کی وہ کامرانیاں جھلملاتی دکھائی دیتی ہیں جو ایک آہنی عزم اور ناقابلِ شکست استقلال کا مقدر ہوا کرتی ہے۔

ماضی قریب میں ہم جن المناک حوادث سے دوچار ہوئے ہیں اور جن مہیب خطرات میں ہم اب بھی گھرے ہوئے ہیں اُن کے سبب بقولِ اقبال ہم نے اپنی حالت کچھ یوں بنا رکھی ہے کہ

حوصلے وہ نہ رہے دل نہ رہا ہم نہ رہے

نظریۂ پاکستان کہ جس کا مقصود بزبانِ اقبال اسلام کے مثالی تصورات کو کون و مکان کی قوتوں میں منتقل کرنا تھا اُسے ہم نے قائدِ اعظم کی وفات کے ساتھ ہی زینتِ طاقِ نسیاں بنا دیا۔ اقبالی تصورِ مملکت کی رُو سے تو پاکستان کی ہیئتِ حاکمہ کو تا بحدِ بشریت صفاتِ خداوندی کا مظہر ہونا چاہیے تھا۔ لیکن گزشتہ ربع صدی میں یہاں پر سیاست کا جو کھیل کھیلا گیا ہے اس سے تو شیطنت ہی کو فروغ ملا ہے اس کھیل سے اہلِ پاکستان کو قومی ذلت و رسوائی کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہوا ہے۔ مکافاتِ عمل کے آفاقی قانون کے مطابق اس کے سوا اور حاصل بھی کیا ہوتا؟ کانٹے بو کر پھول تو نہیں اُگائے جا سکتے۔

میدانِ سیاست میں اپنے یہاں کے مقلدینِ مغرب نے قومیت، جمہوریت اور سوشلزم کی مستعار راگنیاں کچھ اس بھونڈے اور بے سُرے انداز میں الاپی ہیں کہ ذوقِ سلیم اُن سے بُری طرح مجروح ہوا اور نغمگی

نظریاتِ سیاست کا غازہ پاکستان کے روشن چہرے پر کچھ اس انداز سے لیپا پوتا گیا کہ اقوامِ عالم کو اس کی تابناک شبیہہ ایک دم توڑتے ہوئے عفریت کی صورت دکھائی دی۔

پیشہ ور سیاست دانوں نے دل سے پاکستان کو تصوراتی ریاست نہ جانا کہ قائدِ اعظمؒ کے تصور کا پاکستان ان کی گھٹیا سیاست کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ فرنگی سیاست کے پیچاک میں الجھے ہوئے سیاستدان دوستوں کی تلاش میں نکلے اور چہار دانگِ عالم میں گھوم پھر لئے۔ لیکن دوستی کی جنس نایاب کہیں بھی نہ ملی اور ملتی بھی کیونکر؟ ناپختہ ذہن اور فکرِ خام کی حامل قوم کو کون منہ لگاتا؟ دوستی کا مستحق تو ہمیں کسی نے بھی نہ جانا۔ ہاں ایک دو جانب سے فریبِ دوستی میں ہمیں مبتلا ضرور کر دیا گیا کہ مغرب کی سیاست کا یہ بھی ایک کارگر حربہ ہے۔ حیف تو ہم پر ہے کہ ہم فریب کھانے پر ہمہ وقت آمادہ و تیار رہے۔ اس سادہ لوحی اور خود فریبی کا انجام ہمارے سامنے ہے۔ آدھا ملک اس آسانی سے ہمارے ہاتھوں سے نکال لیا گیا گویا کہ ٹکے کی پتنگ تھی جس کی ڈور کٹ گئی اور وہ فضا کی پہنائیوں میں کھو کر ہماری نگاہوں سے کہیں دور جا گری۔

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی

لیکن ان رسوائیوں سے بھی تو ہم نے کچھ سبق نہ سیکھا۔ عوام کی حالت اب بھی یہ ہے کہ ـــ شہری ہو دیہاتی ہو مسلمان ہے سادا ـــ دردِ ملت سے ناآشنا مفاد پرست سیاست دان اس سادگی سے خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ کشتیٔ ملت میں انتشار و افتراق کے بیج بو کر اپنی قسمت بنانے اور ملت کا مقدر بگاڑنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ ملک و ملت کا نام لیتے ہیں۔ اسلام کی دہائی بھی دیتے ہیں لیکن عوام فریبی کے لئے اور زیبِ داستان کے لئے۔

حکایت قدِ آں یار دل نواز کنم
باایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

ان کی سیاست کا اصل مقصود حبِ اقتدار اور گروہی مفاد کا تحفظ اور فروغ ہے۔ ایوانِ حکومت میں در آتے ہیں، نکال دیئے جاتے ہیں۔ حکومتیں بدلتی ہیں۔ حکمران بدلتے ہیں۔ ہر حکمران نئے دعاوی اور جدید نعروں کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ لیکن بنظرِ غور دیکھئے تو ہر جدید کو بھی قدیم ہی کا چربہ پایئے گا۔ نہ ندرتِ خیال نہ جدتِ کردار!

طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

مسندِ حکومت پہ ہوئے تو سب کچھ کر گزر رہا۔ اور ایوانِ حکومت سے نکالے گئے یا وہاں تک پہنچ نہ پائے تو حکومت کے خوب کو ناخوب کہنا اور اس کے محاسن کو معائب کا نام دینا فرضِ عین قرار پایا کہ یہی ایک سبق تو ہے جو ہم نے مغربی جمہوریت سے سیکھا ہے۔ کاش کہ جمہوریت اور سوشلزم کے پجاریوں کو قرآن کو قرآن سمجھ کر پڑھنے کی توفیق ملی ہوتی، تو ان سے یہ بات مخفی نہ رہتی کہ خدائے ذوالجلال کی اس کتابِ عظیم نے ہر فردِ انسانیہ کو باوقار معاشی کی جو ضمانت دی ہے اور اظہارِ فکر کی جو آزادی عطا کی ہے، کارل مارکس کی سوشلزم اور مغرب کی جمہوریت کا تصور وہاں تک نہیں پہنچ پایا ہے۔

جمہوریت اور سوشلزم کی سیاہ رنگ عینک میں سے (جو بجبر ہماری آنکھوں پر چڑھا دی گئی ہے) ہم مستقبل میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں تو تاریکی کے سیاہ بادلوں کے سوا کچھ بھی تو دیکھ نہیں پاتے۔ قطع نظر ان تلخیوں کے جو ان نظریات نے اُن اقوام کی زندگیوں میں گھول رکھی ہیں جن اقوام کے درمیان سے یہ دبائیں پھوٹیں پاکستان ان کی ہلاکت آفرینیوں کا اب مزید متحمل نہیں ہو سکتا۔ پاکستان 'اسلام کے مقدس نام پر قائم ہوا اور فرمودۂ قائدِ اعظمؒ کے مطابق یہاں پر سیاست اور معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود کا تعین احکامِ قرآنی کے تابع ہونا تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ یہاں جس نے قرآن کے حق میں آواز اٹھائی اُسے ہدفِ ملامت بنایا گیا۔

نوا اس باغ میں بلبل کو ہے سامانِ رسوائی

تاہم ہم مایوس نہیں کہ مایوسی شیوۂ کافری ہے۔ ہم فکرِ اقبال کے شیدائی ہیں۔ ہم قائدِ اعظمؒ کے نظریۂ پاکستان کے علمبردار ہیں۔ ہم قرآن کے طالب علم ہیں۔ ہم پیروانِ دعوتِ ایمانی ہیں۔ ہمارے سینے نورِ ایمان سے منور ہیں۔ ہم دعا اور قبولِ دعا پر یقین رکھتے ہیں۔ دعا، کہ نام ہے شدتِ آرزو کا۔ اس آرزو کا کہ جس کی تکمیل میں ہمارے ہاتھ، دعا کے لئے بلند ہونے سے پہلے ہی مصروفِ عمل ہو جائیں۔ یہی بے تاب آرزو دعا کا درجہ پاتی ہے۔ اور سزاوارِ قبولیت ٹھہرتی ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ!

قیامِ پاکستان کے وقت سے سینوں میں پرورش پانے والی چند بیتاب تمنائیں اظہار کی راہوں کی تلاش میں ہیں۔ طلوعِ اسلام ایک فکری تحریک ہے۔ تحریک کے بانی نے کمال ہوشمندی سے تحریک کو عملی سیاست سے الگ رکھا تحریک اپنے مقاصد میں بہر نوع کامیاب رہی۔ اس کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ بلند سطح کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی گفتگو اب طلوعِ اسلام ہی کی زبان میں کی جاتی ہے۔ حتےٰ کہ تحریک کے شدید ترین مخالف بھی، اس کے اثرات کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ وہ بھی اس کی زبان اپنانے پر مجبور ہوئے ہیں کہ اب طلوعِ اسلام کی زبان ہی ان امور میں سکہ بند اور ٹکسالی زبان ہے۔

اڑالی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

لیکن ہمیں اس پر تعجب ہے نہ حیرت۔ ہاں یہ آرزو ضرور ہے کہ بات زبان و اندازِ بیان تک ہی نہ رہے خدا کرے کہ ان کی فکر بھی طلوعِ اسلام کی فکر بن جائے۔

میں بات کر رہا تھا بیتاب تمناؤں کے اظہار کی راہ کی تلاش کی۔ طلوعِ اسلام کے ابلاغِ عام کے محل ازعم ملک میں انتشار و افتراق کا دور دورہ ہے سیاسی جماعت سازی اور گروہ بندی نے ملی اتحاد کی پامالی میں تو مذہبی فرقہ آرائی کو بھی مات دے دی ہے۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ملک کی کتابِ آئین میں جہاں یہ مذکور ہے کہ ملک میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہ بن سکیگا وہاں ہماری بے بصری سے اس میں ایک ایسی شق بھی رکھ دی گئی ہے کہ جس کی رُو سے سیاسی جماعتوں کی تشکیل کو بطور ایک آئینی حق کے تسلیم کیا گیا ہے۔ آئین سازوں میں علماء کے نمائندگان بھی شامل تھے۔ پوچھا جا سکتا ہے کہ آئین کی یہ شق وضع

کرتے وقت کیا ان مقدس حضرات کے ذہن میں کتاب اللہ کی وہ آیات نہ تھیں کہ جن میں گروہ بندی کو شرک قرار دیا گیا ہے؟ لیکن ان مقدسین سے گلہ عبث ہے کہ گروہ سازی اور فرقہ آرائی تو قدیم سے ان کا مشغلہ رہا ہے البتہ بات ہمارے اپنے سوچنے کی ہے کہ پاکستان کی سیاست اگر اسی نوع جمہوریت کی پابندی کہ جس کی بنیاد ہی گروہ بندی اور پارٹی سازی پر رکھی گئی ہے تو کیا یہ ملک جاپان بھارت وغیرہ کی طرز کا ہی ایک سیکولر ریاست نہ ہوگا؟ تو پھر کیا ہم یہ سب کچھ خاموش تماشائی بنے ہوئے دیکھتے رہیں؟ میرا یہ سوال تحریک طلوع اسلام سے وابستہ تمام خواتین و حضرات سے ہے کہ طلوع اسلام کی فکری تحریک نے اہل دانش کے اذہان میں عظیم انقلاب تو بپا کر دیا ہے لیکن اس کے علی الرغم ہم اگر اپنی سیاست کے انداز نہیں بدل سکے ہیں تو کیا طلوع اسلام کو اب بھی جبکہ غیر قرآنی انداز کی سیاست کی تباہ کاریاں کھل کر ہمارے سامنے آچکی ہیں ایک فکری تحریک ہی کا کردار ادا کرتے رہنا چاہیئے؟ میں نہیں جانتا آپ کا جواب کیا ہوگا، میرا اپنا جواب یہ ہے کہ تحریک کو سیاست میں الجھ کر اپنا اصل مقام نہ کھو دینا چاہیئے کہ عملی سیاست میں الجھ جانے سے جو کام تحریک اب تک کر پائی ہے اس کے اثرات بھی مٹ جانے کا شدید خدشہ ہے۔

اقبال خوش قسمت تھا کہ اسکے نظریۂ پاکستان کو جامۂ عمل پہنانے کو مسلم لیگ کی باگ ڈور جناح نے سنبھال لی ہماری بے قرار تمنائیں جو اظہار کی راہ کی تلاش میں ہیں ان کو گروہی سیاست کی خارداروں سے بچائے رکھنا اور اپنی نگاہوں کو شاہراہ قرآن پر لگائے رکھنا ہی وہ دشوار تر کام ہے جو بہرطور ہمیں جاری رکھنا ہے اور اس ساعت کا منتظر رہنا ہے جب پاکستان کے افق پر کسی جناح کا طلوع ہو جو اس قرآنی شمع کو لے کر آگے بڑھے۔ ہمارا فریضہ اس شمع کو روشن رکھنا اور تابندہ تر بنانا ہے۔ ہم کسی جناح کی آمد کے منتظر کیوں ہیں، اس کا جواب حضرت علامہ کے ایک مصرعہ میں مل جاتا ہے۔

کہ روح پاک بدن کی تلاش میں ہے ابھی

ضروری اعلان

ادارہ کی نئی کتاب — "شاہکار رسالت" — منگانے کے لئے مبلغ -/۳۷ روپے منی آرڈر کریں — کتاب کی قیمت مبلغ -/۳۵ روپے اور ڈاک خرچ -/۲ روپے ہے۔

(ناظم)

نوٹ

قارئین طلوع اسلام نوٹ فرمالیں کہ ادارہ طلوع اسلام سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور تحریر کیا کریں۔ بصورت دیگر خط و کتابت کا جواب نہیں دیا جائے گا۔

(ناظم)

غیر مستطیع حضرات کے لئے ایک خصوصی پیشکش

ہمارے پاس اکثر ایسے احباب کے خطوط آتے رہتے ہیں، جو ماہنامہ طلوع اسلام کا باقاعدہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں لیکن اُن میں اتنی استطاعت نہیں ہوتی کہ پندرہ روپے چندہ ادا کر سکیں۔ قرآنی فکر سے وابستہ ایک مخیر دوست نے یہ پیشکش کی ہے کہ اگر ایسے غیر مستطیع شائقین نصف چندہ (یعنی ساڑھے سات روپے) ادا کر دیں تو وہ بقایا ساڑھے سات روپے اپنی طرف سے ادا کر دیں گے۔ اور یوں اُن کے نام سال بھر کے لئے طلوع اسلام جاری ہو جائے گا۔

سرکاری اور دینی درس گاہوں کے طلباء، نیز ائمہ مساجد و اساتذہ حضرات کو ترجیح دی جائے گی۔ اس رعایت سے فائدہ اٹھانے والے حضرات ساڑھے سات روپے بذریعہ منی آرڈر ہمیں بھیج دیں۔ رسالہ اُن کے نام سال بھر کے لئے جاری کر دیا جائے گا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

ضرورت رشتہ

ایک شریف خاندان کے پچیس سالہ صحت مند گریجویٹ کے لئے جو دو سو روپے ماہانہ کی ملازمت کے ساتھ ایک متوسط درجہ کے کاروبار میں شراکت رکھتا ہے، ضلع ساہیوال کے کسی قرآنی فکر سے منسلک گھرانہ کی دوشیزہ کا رشتہ درکار ہے۔ (خط و کتابت بصیغۂ راز)

م - ل معرفت ادارہ طلوع اسلام - ۲۵ - بی - گلبرگ ۲ - لاہور

اعلان

ادارے کی ڈاک میں بسا اوقات ایسے منی آرڈر آتے ہیں جن میں بھیجنے والے کا پورا پتہ لکھا ہوا نہیں ہوتا یا یہ وضاحت نہیں کی ہوتی کہ منی آرڈر کس مقصد کے لئے ارسال کیا گیا ہے۔ مثلاً لیا ترسیل کتب، یا نئی خریداری رسالہ یا محض تجدید خریداری یا پیشگی کھاتہ وغیرہ کے لئے ہے۔

نامکمل کوائف کی صورت میں ان رقوم کی وصولی کے بعد ان کے اندراج میں بھی کافی دقت پیش آتی ہے اور تعمیل فرمائش میں بھی۔

اندریں حالات گزارش ہے کہ منی آرڈر ارسال کرتے وقت اُس کے کوپن پر اپنا پورا پتہ اور جس مد میں روپیہ بھیجا جا رہا ہے اس کی وضاحت کر دیا کریں۔

ناظم

لاہور میں سپیئر پارٹس کی مشہور دکان

سٹینڈرڈ آٹوموبائلز

پر تشریف لائیے

سپیشلسٹ:- ڈاج - بیڈفورڈ - بی لینڈ - بی - ایل - ایم - سی - ڈیلرز:- موٹر پارٹس - ٹرک - جنرل پارٹس

۱۳۵ - بادامی باغ - ٹیلیفون ۶۹۰۱۲ - لاہور

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں

ہر اتوار - صبح ۹½ بجے

بمقام

۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور

ٹیلیفون: ۸۰۸۰۰

لائل پور میں

بعد جمعہ - (بذریعہ ٹیپ)

۳½ بجے - بعد نماز جمعہ

بمقام:- دفتر بزمِ طلوعِ اسلام -

راجہ چوک - ریل بازار لائلپور

رابطہ کے لئے - ٹیلیفون ۲۴۹۴

ملتان میں

ہر جمعہ (بذریعہ ٹیپ)

بعد نماز جمعہ

بمقام:- دفتر شاہ سنز

بیرون پاک گیٹ - ملتان

ٹیلیفون ۲۰۷۱

سیالکوٹ میں

ہر اتوار - صبح ۹½ بجے (بذریعہ ٹیپ)

بمقام:- چوہدری محمد دین - ڈی سٹال

کرسچن ٹاؤن - سیالکوٹ ۲

کراچی میں

ہر اتوار - صبح ۹½ بجے - (بذریعہ ٹیپ)

بمقام:- دفتر بزم طلوعِ اسلام - ۱۳/۱ فردوس مارکیٹ

(بالمقابل بس سٹاپ) پہلی چورنگی - ناظم آباد - کراچی ۱۸

ٹیلیفون ۶۱۰۴۶۸

کوئٹہ میں

ہر اتوار - ۳½ بجے بعد دوپہر -

(بذریعہ ٹیپ)

بمقام:- ۳۰ گوردت سنگھ روڈ

فون ۷۰۷۰۰ کوئٹہ

راولپنڈی میں

ہر جمعہ - ۴ بجے سہ پہر - (بذریعہ ٹیپ)

بمقام:- جی ۱۷۶ - لیاقت روڈ

راولپنڈی

واہ میں

ہر جمعہ - بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ)

بمقام:- ۱۵ - جہلم روڈ

واہ (WAH)